ماہنامہ

محدث

بنارس

اکتوبر ۲۰۲۲ء ◆ ربیع الاول ۱۴۴۴ھ

محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں	۲
ماہ ربیع الاول اور مسلمان	۳
مدارس اسلامیہ امن وشانتی کے پیغامبر	۵
اسلامی رواداری کے اصول وضوابط	۱۰
آثار صالحین سے تبرک کی شرعی حیثیت	۲۳

دارالتالیف والترجمہ، بنارس، الہند

دینی، علمی، اصلاحی اور تحقیقی ماہنامہ

مجلہ محدث بنارس

ربیع الاول ۱۴۴۴ھ
اکتوبر ۲۰۲۲ء

جلد: ۳۹
شمارہ: ۴

سرپرست
عبداللہ سعود سلفی

مدیر
محمد ایوب سلفی

معاون مدیر
اسرار احمد ندوی

مجلس مشاورت
مولانا محمد مستقیم سلفی
مولانا محمد ابوالقاسم فاروقی
مولانا صلاح الدین مقبول مدنی
مولانا محمد یونس مدنی
ڈاکٹر عبدالصبور ابوبکر مدنی

اس شمارہ میں

۱۔ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں	عبداللہ سعود سلفی	۲
۲۔ ماہ ربیع الاول اور مسلمان	ڈاکٹر عبدالحلیم مدنی	۳
۳۔ مدارس اسلامیہ امن وشانتی کے پیغامبر	مدیر	۵
۴۔ اسلامی رواداری کے اصول وضوابط	ڈاکٹر عبدالحلیم مدنی	۱۰
۵۔ سنن رواتب کے احکام ومسائل	ڈاکٹر عبدالصبور مدنی	۱۵
۶۔ آثار صالحین سے تبرک کی شرعی حیثیت	طارق اسعد	۲۳
۷۔ ابوالعلاء مَعَرِّی کا ایک شعر اور نظریہ ارتقاء	عبدالعلیم سلفی	۲۹
۸۔ بہائیت: عقائد وافکار	محمد ایوب سلفی	۳۵
۹۔ اساتذہ وطلبہ کے درمیان باہمی رشتے	مجاہد الاسلام	۳۹
۱۰۔ ماہ ربیع الاول اور ہماری ذمہ داریاں	سمیہ خاتون	۴۳
۱۱۔ اخبار جامعہ	مولانا دل محمد سلفی	۴۵
۱۲۔ باب الفتاویٰ	مولانا نور الہدیٰ سلفی	۴۷

بدل اشتراک سالانہ

ہندوستان:	300	روپے
خصوصی تعاون:	1000	روپے
بیرون ممالک:	50	ڈالر امریکی
فی شمارہ:	30	روپے

مراسلت کا پتہ

اشتراک کے لیے ڈرافٹ مندرجہ ذیل نام سے بنوائیں
Name: **DAR-UT-TALEEF WAT-TARJAMA**
Bank: **INDIAN BANK,** KAMACHHA, VARANASI
A/c No. **21044906358**
IFSC Code: IDIB000V509

Darut Taleef Wat Tarjama, B.18/1-G, Reori Talab, Varanasi - 221010

www.mohaddis.org

نوٹ: ادارہ کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

درس قرآن

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ (سورہ فتح:۲۹)
محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں

عبداللہ سعود

بنی نوع انسان کی سب سے بزرگ اور برگزیدہ شخصیت، سارے جہان کے لیے رحمت، فخر انسانیت، خالق کائنات کا محبوب ترین بندہ، محترم ومکرم ومعظم جناب حضرت محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب القرشی الہاشمی علیہ افضل الصلاۃ والتسلیم مکہ مکرمہ جزیرۂ عرب میں ۵۷۱ء میں پیدا ہوئے۔ چالیس سال کی عمر میں نبی ورسول بنائے گئے۔ (۱۳) تیرہ سال تک مکہ مکرمہ میں تبلیغ کی۔ (۵۳) ترپن سال کی عمر میں ہجرت کرکے مدینہ منورہ آگئے اور (۶۳) سال کی عمر میں ۱۱ھ مطابق ۶۳۲ء کو اس دنیا سے انتقال کر گئے اور رہتی دنیا میں قیامت تک کے لیے اپنا بہترین اخلاق سب سے عمدہ تعلیمات، سب سے منظم اور انصاف کرنے والی بااخلاق صحابہ کرام کی ٹیم اور اپنا اسوۂ حسنہ چھوڑ گئے۔ آپ کے بعد نہ کوئی نبی آئے گا نہ کوئی شریعت آئے گی۔ آپ کی لائی ہوئی شریعت اسلام اللہ کا پسندیدہ آخری دین ہے اور آپ تمام انبیاء ورسل کے امام وسردار خاتم النبیین ہیں۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام آپ پر نازل ہوا، جو دنیا کی سب سے بلیغ کتاب ہے۔ آپ علیہ الصلاۃ والسلام پڑھے لکھے نہیں تھے امّی تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے سب سے بلیغ کلام آپ کو عطا فرمایا جس کو آپ مکہ والوں کو پڑھ کر سناتے۔ مکہ والے جو اپنی زبان دانی پر فخر کرتے تھے متحیر اور پریشان تھے۔ اس کو کاہن کا کلام کہتے، جادوگر کا کلام کہتے کیونکہ وہ بت پوجنے والے تھے، ایک اللہ پر ایمان نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو یہ عظیم کتاب قرآن مجید بطور معجزہ عطا فرمایا۔ ایک ان پڑھ امی انسان نے سب سے عظیم اور بلیغ وفصیح کلام پیش کیا جو انسانیت کے لیے رشد وہدایت اور حق وباطل کے لیے فرقان اور قیامت تک کے لیے محمد ﷺ کا لایا ہوا زندہ معجزہ ہے۔

ایسی عظیم شخصیت پر ایمان لانا ہم پر اللہ تعالیٰ کا احسان ونعمت ہے۔ اللہ رب العالمین ہم کو بروز قیامت آپ کے امتی کے زمرہ میں اٹھائے اور آپ کی شفاعت ورفاقت نصیب فرمائے۔ آمین

وصلی اللہ علی نبینا وحبیبنا وإمامنا محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم تسلیما کثیرا کثیرا۔

■ ■

درس حدیث

ماہ ربیع الاول اور مسلمان

ڈاکٹر عبدالحلیم بسم اللہ

ربیع الاول ہجری سال کا تیسرا مہینہ ہے۔ ہمارے نبی محمد ﷺ کی ولادت باسعادت اسی ماہ میں ہوئی اور اسی مہینے میں آپ ﷺ کی وفات بھی ہوئی۔ جس طرح نبی ﷺ کا ورود مسعود اس دنیا کے لیے رحمت و برکت ہے اسی طرح آپ کا فوت ہو جانا ساری امت کے لیے دکھ اور تکلیف کا باعث ہے لہٰذا اس ماہ کو دیگر مہینوں کے مقابلے میں افضل اور برتر سمجھنا کج فہمی کی دلیل ہے۔ برصغیر میں خصوصاً اور عالم اسلام میں عموماً مسلمان اس ماہ میں عیدین کی طرح خوشیاں مناتے ہیں۔ عید میلاد النبی کے نام پر مجلسیں منعقد کرتے ہیں، ذکر واذکار کی محفلیں لگاتے ہیں، روشنیوں اور قمقموں سے گھروں اور گلیوں کو سجاتے ہیں، جھنڈے گاڑتے ہیں، جلوس نکالتے ہیں، مرد وزن کا اجتماع کراتے ہیں اور سیرت رسول، سیرت النبی ﷺ کے نام سے بے شمار رسوم ورواج انجام دیتے ہیں اور یہ تمام اعمال وافعال محبت رسول کے نام پر کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان چیزوں کی کوئی دلیل کتاب وسنت میں نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں اپنا میلاد نہیں منایا۔ ان کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ میں سے کسی نے بھی اپنے زمانۂ خلافت میں ان چیزوں کا اہتمام نہیں کیا۔ ان کے بعد صحابہ کرام، تابعین عظام میں سے بھی کسی نے میلاد النبی کے نام سے نہ ہی کوئی عید منائی اور نہ ہی اس کا حکم دیا۔ حالانکہ یہی لوگ انبیاء ورسل کے بعد امت کے سب سے افضل اور نیک لوگ ہیں اور اللہ اور اس کے رسول سے بے انتہا محبت کرنے والے ہیں۔

سب سے پہلے عید میلاد النبی کی ابتدا کرنے والا شخص مظفر ابوسعید کوکبری ہے جو کہ موصل کے علاقے اربل کا بادشاہ تھا۔ یہ عبیدیوں رافضیوں کا حاکم تھا اور ان ہی لوگوں نے چوتھی صدی ہجری میں سب سے پہلے اس بدعت کی ایجاد کی۔

اور دین میں اجر وثواب کی نیت سے کوئی ایسی چیز ایجاد کرنا جو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کے زمانہ میں نہیں تھی وہ بدعت ہے اور بدعت کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''وکل بدعة ضلالة'' (سنن ابی داود: ۴۶۰۷، وصححہ الالبانی) اور ہر بدعت ضلالت وگمراہی ہے۔

اور ہر ایجاد کردہ عبادت مرفوض ومردود ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: ''من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد'' (بخاری: ۲۶۹۷، مسلم: ۱۷۱۸) دین میں اگر کسی نے کوئی بھی نئی چیز ایجاد کی تو وہ مردود ہے۔

اور جو لوگ ان بدعات وخرافات پر عمل کرتے ہیں اور اس کے کرنے کو اجر وثواب سمجھتے ہیں ان کے لیے اللہ کے رسول ﷺ کا اعلان ہے: ''من عمل عملا ليس عليه أمرنا فهو رد'' (بخاری: ۲۶۹۷، مسلم: ۱۷۱۸) دین میں

اگر کسی نے اجروثواب کی نیت سے کوئی ایسا کام کیا جو کتاب وسنت میں نہ ہو وہ مردود ہے اس پر کوئی اجروثواب نہیں ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا کہ ''میرے بعد تم لوگ میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑنا، دین میں ایجاد کردہ نئی نئی باتوں سے مکمل اجتناب کرنا، کیونکہ دین میں ایجاد کردہ ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت ضلالت ہے۔'' (سنن ابی داود: ۴۶۰۷، وصححہ الالبانی)

بدعت ایجاد کرنے اور اس کی اشاعت کرنے والوں کو قیامت کے دن حوض کوثر سے بھگا دیا جائے گا جیسا کہ صحیح بخاری (۶۲۱۲) اور صحیح مسلم (۲۲۹۰) میں وارد ہے کہ نبی کریم ﷺ حوض کوثر پر اپنے امتیوں کا استقبال کریں گے، جو نبی کریم ﷺ کے پاس آئے گا وہ حوض سے پانی پیئے گا اور جو اس پانی کو پی لے گا وہ کبھی پیاسا نہ ہوگا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: پھر کچھ لوگ میرے پاس آئیں گے میں ان کو پہچانوں گا وہ مجھے پہچانیں گے، پھر ان لوگوں کو میرے پاس آنے سے روک دیا جائے گا، پھر میں کہوں گا کہ یہ لوگ میرے امتی ہیں، تو کہا جائے گا آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کے بعد ان لوگوں نے دین میں کیا کیا چیزیں ایجاد کر لی تھیں تو میں کہوں گا کہ جن لوگوں نے میرے بعد دین میں تبدیلی کر دی ان کو مجھ سے دور کرو، ان کو مجھ سے دور کرو۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ عید میلاد النبی منانا بدعت ہے۔ یہ سراسر ضلالت وگمراہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے محبت کا اظہار سال میں صرف ایک رات قرآن پڑھ کر، اچھے اچھے کپڑے پہن کر، قسم قسم کے لذیذ کھانے کھلا کر، گھروں، گلیوں کو چراغاں کر کے، سڑکوں پر جلوس نکال کر، عید میلاد کی محفلیں منعقد کر کے سراسر غلط ہے۔ نبی ﷺ سے حقیقی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی سیرت پر عمل کریں۔ ان کے احکام کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کریں۔ فرائض، واجبات کی پابندی کریں۔ سنن ونوافل کا اہتمام کریں۔ والدین کی خدمت کریں۔ رشتے داروں کے ساتھ صلہ رحمی کریں۔ پڑوسیوں کے حقوق ادا کریں۔ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کریں۔ امانت ودیانت کو اپنا شعار بنائیں۔ اخلاق وکردار کا اعلیٰ نمونہ پیش کریں۔ کفریہ وشرکیہ اعمال کے بالکل قریب نہ جائیں۔ تکبر وتمرد سے باز رہیں۔ جھوٹ فریب سے اجتناب کریں۔ چغلی غیبت سے پرہیز کریں۔ فریب ودھوکہ دھڑی سے بچیں۔ فسق وفجور سے دور رہیں۔ خود نیک بنیں اور دوسروں کو نیکی کا حکم دیں۔ خود برائیوں سے بچیں دوسروں کو بھی برائیوں سے روکیں۔ رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کریں۔ کتاب وسنت کو عملی زندگی میں نافذ کریں۔ عبادات کا اہتمام کریں۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو اپنے قول وعمل سے عام کریں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ زندگی بھر ان ہی اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ کی دعوت دیتے رہے۔ لوگوں کو اس کی طرف بلاتے رہے اور خود ان پر عمل پیرا رہے۔ لہٰذا ان سے حقیقی محبت کا یہی سیدھا اور سچا راستہ ہے۔

وصلی اللہ علی نبینا محمد وعلی آلہ وصحبہ أجمعین۔

■■

مدارس اسلامیہ امن وشانتی کے پیغامبر

مدیر

ہر دور میں غیر مسلمین اور اعداء اسلام، اسلام، مسلمانوں اور مسلمانوں سے متعلق ہر چیز کو اپنا نشانہ بناتے رہے ہیں۔ کبھی قرآن مقدس ان کے نشانے پر رہتا ہے تو کبھی پیغمبر اسلام کے تقدس کو پامال کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ اسلامی تہذیب وثقافت، اسلامی اقدار واعمال، اسلامی افکار وعقائد، اسلامی عادات واطوار سب میں ان کو نقص اور کمی نظر آتی ہے۔ یہ سلسلہ آج سے نہیں بلکہ آمد اسلام کے اول دن سے چل رہا ہے، کبھی اس میں شدت آتی ہے کبھی نرمی اور کبھی اتنی شدت پیدا ہوتی ہے کہ مسلمانوں کا جینا مشکل ہو جاتا ہے، لیکن اللہ کی مدد ہر حال میں مسلمانوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اللہ اپنے دین اور اپنے مومن بندوں کی ہر حال میں حفاظت کرتا ہے اور انہیں اپنی تائید غیبی سے نواز کر انہیں سرخروئی عطا فرماتا ہے۔

آج مدارس اسلامیہ اعداء اسلام کے نشانے پر ہیں، انہیں دہشت گردی اور شدت پسندی کے اڈے کے طور پر مشتہر کرنے کی ناکام کوشش کی جارہی ہے۔ اس مضمون میں مدارس اسلامیہ کے پیغام امن وشانتی کو واضح کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر جو عظیم احسان فرمایا ہے وہ ہے پیغمبر اسلام محمد ﷺ کی اس کائنات میں بعثت۔ آپ ﷺ اس دنیا میں محسن انسانیت بن کر آئے اور انسانوں تک اللہ کا پیغام پہنچایا۔ ارشاد ربانی ہے: لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُولاً مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُواْ مِن قَبْلُ لَفِيْ ضَلاَلٍ مُّبِيْنٍ (آل عمران: ۱۶۴) بے شک مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ ان ہی میں سے ایک رسول ان میں بھیجا جو انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے۔ یقیناً یہ سب اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

اس آیت کریمہ کے اندر بعثت نبوی کے تین مقاصد بیان کئے گئے ہیں: تلاوت آیات، تزکیۂ نفس اور تعلیم کتاب وحکمت۔ دراصل اسلام نے تعلیم وتربیت اور تزکیۂ نفس پر بہت زیادہ زور دیا ہے اس لیے ہر دور میں مسلمانوں نے تعلیم وتربیت سے قوم مسلم کو آراستہ کرنے کا خاص اہتمام کیا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مدارس اسلامیہ کی بنیاد کسی نہ کسی شکل میں دور نبوی ہی کے اندر پڑ چکی تھی۔ آپ ﷺ کو جب اللہ تعالیٰ نے دنیا میں نبی بنا کر مبعوث فرمایا، اسی وقت سے آپ ﷺ نے تعلیم اور تبلیغ دونوں کا اہتمام کرنا شروع کر دیا تھا۔

آپ ﷺ نے مکی دور میں خفیہ دعوت کا جو بار گراں سنبھالا اس درمیان جو لوگ بھی مسلمان ہوتے تھے ان کی تعلیم

وتربیت کے لیے انہیں خاص مقامات پر جمع فرماتے اور انہیں اسلامی آداب، اسلامی تعلیمات اور اسلامی عقائد واعمال سے آراستہ کرتے۔ اس کام کے لیے آپ ﷺ نے دارارقم کو خاص کر رکھا تھا لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کا اولین مرکز مکی زندگی میں دارارقم تھا۔

پروفیسر ڈاکٹر یاسین مظہر صدیقی اپنے ایک مضمون ''عہد نبوی کے تعلیمی ادارے'' میں رقم طراز ہیں: یہاں اس نقطہ کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ تبلیغ اسلام، خواہ آپ کے دست مبارک کے ذریعہ انجام پذیر ہوئی ہو، خواہ آپ کے صحابہ کرام کی مساعی کے ذریعہ، تعلیم اسلامی کا مغز اور لب لباب کی حیثیت رکھتی تھی کہ وہ اسلام کے بنیادی عقائد، اصلی افکار، مذہبی فرائض اور تمام دوسری لازمی اخلاقی تعلیمات کو اپنے مدعوین کے سامنے پیش کرتی اور ان کے قلوب واذہان کو ان سے روشناس کراتی اور ان کے شعور وادارک کو اسلام کا علم عطا کرتی تھی اس لیے تبلیغی ادارے بھی تعلیمی ادارے تھے اس میں اگر کچھ فرق تھا تو وہ مخاطبوں اور مدعوؤں کے ردعمل کے زاویے سے تھا، داعی اور معلم کی طرف سے نہ تھا کہ وہ مبلغ ومعلم بیک وقت دونوں تھے۔

(ملک وملت کی تعمیر اور دینی مدارس، ص:۷۶)

دراصل آپ ﷺ جب تک مسلمانوں کے درمیان زندہ اور باقی رہے آپ تبلیغ اور تعلیم دونوں کا فریضہ بذات خود ادا کرتے رہے اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ مدارس اسلامیہ کی تاریخ دور نبوت سے ہی ملتی ہے۔

دارارقم کی دعوتی وتعلیمی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر ڈاکٹر یاسین مظہر صدیقی صاحب مزید فرماتے ہیں: دار ارقم کے قیام اور اس میں رسول اکرم ﷺ کی سکونت منصبی کے ساتھ مکی عہد اور اسلام کا سب سے بڑا اور مستقل مرکز اور تعلیم وتدریس کا عظیم ترین ادارہ وجود میں آیا۔ شہری چہل پہل سے الگ تھلک اور دشمنوں کی نگاہ حسد سے محفوظ کوہ صفا کی تلی میں واقع اس مخزومی مکان میں رسول اکرم ﷺ بطور معلم اول قیام فرما رہتے اور مسلم طالبان حق اکا دکا چھپتے چھپاتے دوپہر کے سناٹے، رات کی تاریکی اور صبح سویرے کے جھٹ پٹے میں اس نبوی ادارۂ تعلیمی میں تعلیم وتعلم کے لیے آتے جاتے اور دوسرے طالبان حق وعلم کو لاتے لے جاتے۔ یہی وہ تعلیم گاہ نبوی تھی جہاں حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی اور عمر بن خطاب عدوی جیسے اکابر قریش مکہ نے اور حضرت ابوذر غفاری اور انیس غفاری رضی اللہ عنہم جیسے غرباء دیار نے اسلام وقرآن کی تعلیمات حاصل کی تھیں اور یہیں سے حضرت عبداللہ بن مسعود ہذلی اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہما نے تعلیم نبوی سے سرشار ہو کر مسجد حرام میں اعلانیہ تلاوت قرآن کر کے اکابر قریش کو پیغام حق سنایا اور تعلیم دین سے روشناس کرایا تھا۔ مکی دور حیات طیبہ میں تقریباً دس سال تک دارارقم اسلام کے اہم ترین مراکز وعظیم ترین تعلیمی اداروں میں سے ایک تھا۔

(ملک وملت کی تعمیر اور دینی مدارس، ص:۷۸)

ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعلیم وتربیت کا خاص اہتمام کیا۔ وہاں بھی آپ نے پہلے قبا میں پھر مدینہ میں مسجد نبوی کی تعمیر کر کے مسلمانوں کے لیے تعلیم گاہیں بنائیں۔

علامہ صفی الرحمن مبارک پوری رحمہ اللہ رقم طراز ہیں: نبی ﷺ ان کی تعلیم وتربیت، تزکیۂ نفس اور مکارم اخلاق کی ترغیب میں مسلسل کوشاں رہتے تھے اور انہیں محبت و بھائی چارگی، مجد وشرف اور عبادت واطاعت کے آداب برابر سکھاتے اور بتاتے رہتے تھے۔ (الرحیق المختوم، ص:۲۵۹)

مسجد نبوی میں واقع ایک مقام جسے ''صفہ'' کہا جاتا تھا، اس مقام پر بہت سارے مسلمان قیام پذیر ہوکر رسول اللہ ﷺ سے کسب فیض کرتے تھے۔ سب سے زیادہ احادیث نبویہ بیان کرنے والے عظیم صحابی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اسی ''صفہ'' کے فیض یافتہ ہیں۔ یہاں رہ کر تعلیم حاصل کرنے والے صحابہ کرام کو ''اصحاب صفہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نبوی حیات مبارکہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ آپ ﷺ کے بعد بھی تعلیم وتدریس، تربیت وتزکیۂ نفس کا سلسلہ ہمیشہ چلتا رہا۔ اسی سلسلہ کا امتداد ہے کہ آج دنیا میں بڑے بڑے اسلامی مدارس ومراکز، بڑی بڑی اسلامی یونیورسٹیاں اور چھوٹی بڑی بے شمار تعلیم گاہیں نظر آرہی ہیں۔ یہی مدارس ہیں جو اسلام کو باقی رکھے ہوئے ہیں، اسلامی تعلیمات کی اشاعت وبقا انہی مدارس کی بدولت ہے۔

ہندوستان میں دینی تعلیم وتربیت کا آغاز تو مسلم فاتحین کے دور ہی سے ہوگیا تھا اور یہ سلسلہ مغلیہ دور میں مزید دراز ہوا۔ محمد تغلق (م ۷۵۲ھ مطابق ۱۳۵۱ء) کے عہد میں ہندوستان اور مصر کے درمیان تعلقات عروج پر تھے۔ اسی دور کے ایک مصری سیاح اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ صرف دلی میں ایک ہزار مدرسے تھے، جن میں ایک شافعی اور باقی سب حنفی تھے۔

ایک یورپی سیاح کپتان الیگ ژینڈر ہیملٹن اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں سندھ کے شہر ٹھٹھ کے بارے میں لکھتا ہے: کہ ٹھٹھ میں مختلف علوم وفنون کے چار سو سے زائد مدارس تھے۔ مسلمان اپنے مذہبی ذوق کی بنا پر تعلیم وتعلم کو لازم اور درس گاہوں کے قیام اور علماء اور طلبہ کی خدمت کو سعادت سمجھتے تھے۔ اکبر بادشاہ نے اپنے تمام صوبوں کے گورنروں کے نام ایک فرمان جاری کیا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو علم وہنر کی اشاعت کرتے رہیں تاکہ اہل کمال دنیا سے معدوم نہ ہوجائیں اور ان کی یادگار صفحۂ ہستی پر باقی رہے۔

(ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم، از ڈاکٹر محمد شمیم احمد قاسمی، ماہنامہ الشریعہ جون ۲۰۲۰ء، ص:۶۲)

ہندوستان کے اندر مغلیہ حکومتوں میں تعلیم وتدریس کا بیشتر کام مساجد میں بھی ہوا کرتا تھا۔ علماء اپنی قیام گاہوں پر بھی یہ مقدس فریضہ انجام دیتے تھے۔ بادشاہوں کے درباروں میں بھی علماء تعلیم وتدریس جیسی مشغولیات سے وابستہ رہتے۔ یہ سلسلہ خانوادۂ ولی اللہی تک چلتا رہا۔

جناب خالد حنیف صدیقی صاحب ہندوستان کے اندر حکومت کرنے والے بادشاہوں کے دور کے دینی مدارس ومراکز کا ذکر کرنے کے بعد رقم طراز ہیں: مغلیہ حکومت کے اختتام کے ساتھ ہی انگریزوں نے جب اس ملک پر قبضہ جمایا تو ان لوگوں نے ان تمام مدارس وجامعات اور دینی مراکز کو ملیامیٹ کردیا جو بادشاہوں کے زمانے سے قائم چلے آرہے تھے۔ علماء کرام کو بے دریغ تہ تیغ کیا، کالے پانی بھیج کر بے موت مرنے پر مجبور کیا، عیسائیت کی تبلیغ وترویج پر پوری قوت صرف کردی۔ اس کام کے لیے پوپ اور پادریوں کی ایک فوج اتار دی، لیکن ان ناگفتہ بہ حالات میں بھی علماء نے مساجد میں پناہ گزیں ہوکر، اپنے

گھروں کو مدرسے بنا کر، خانقاہوں کے حجروں کو درس وتدریس کا ذریعہ بنا کر دین اسلامی کے تعلیمی سلسلے کو بند نہ ہونے دیا اور ان بادشاہوں کے قائم کردہ مدارس ومساجد سے صرف نظر کر کے نئے سرے سے چھوٹے بڑے مدارس کی طرح رکھی اور آج بھی بحمد اللہ پورے عالم میں دینی مدارس، مکاتب، جامعات، کلیات اپنی الگ عمارت اور شناخت کے ساتھ اپنی موجودگی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ (مدارس اہل حدیث: ایک تاریخی دستاویز، ص: ۴۵)

ہندوستان کے اندر دینی مدارس کا نظام تعلیم کسی بھی ہندوستانی سے مخفی نہیں ہے۔ ان مدارس میں قرآن وحدیث، فقہ واصول فقہ، عقیدہ، عربی زبان وادب، بلاغت ومعانی اور منطق وفلسفہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ آج مدارس کے نصاب میں وسعت دے کر مروجہ عصری علوم کو بھی قدرے شامل کر لیا گیا ہے تاکہ طلبہ وقت اور حالات سے بالکل بے خبر نہ رہیں۔ انگریزی اور ہندی زبانیں بھی مدارس میں پڑھائی جارہی ہیں۔ آج اسلام اور مسلمانوں سے بغض رکھنے والے لوگ مدارس اسلامیہ، مدارس کے نظام تعلیم، مدارس کے ذمہ داران، مدارس میں درس وتدریس کا فریضہ انجام دینے والے سیدھے سادے اساتذۂ کرام اور مدارس میں پڑھنے والے غریب طلبہ کو نشانۂ تنقید بنا رہے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان مدرسوں کے نظام تعلیم ملک وملت کے لیے بالکل بھی مضر نہیں ہیں بلکہ یہاں پڑھنے وپڑھانے والے علماء وطلبہ اپنے مذہب سے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرتے اور قرآن کی تفسیر، حدیثوں کی شرح، فقہ اسلام، عقائد اسلام، اعمال صالحہ، انسانی ہمدردی، ملک وقوم کے لیے وفاداری، جانثاری وفداکاری کا درس لیتے اور ملک وملت کی اصلاح وتعمیر کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔ اہل نظر اگر مدارس کے نظام تعلیم وتدریس پر سنجیدگی سے غور کریں اور تعصب وتنگ نظری کا عینک اتار پھینکیں تو انہیں بڑی آسانی سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ یہ مدارس ملک میں امن وشانتی کے پیغامبر ہیں۔ انہی مدارس سے نکلنے والے علماء ورجال ملک وملت کے اندر امن وشانتی کے پیغامبر اور داعی ہوتے ہیں۔ دراصل یہ مدارس اسلامیہ اپنے مخصوص نظام اور اپنی خدمات کے لحاظ سے ملک وملک کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی تاریخ اور خدمات سنہرے حروف سے لکھے جانے کے لائق ہیں اور ان میں پڑھنے پڑھانے والے نفوس قدسیہ نے ہر دور میں باوجود بے سروسامانی کے دین اسلام کی حفاظت وصیانت کا قابل قدر فریضہ انجام دیا ہے۔ یہ مدارس مسلم عوام کے چندے اور ان کی عطیات اور صدقات وزکوۃ سے چلتے ہیں۔ ان مدارس کو چلانے والوں کو ان کے نظام کو درست اور بہتر بنانے اور ان کے مصارف واخراجات کے انتظام وانصرام کے لیے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے اور انہیں رات ودن ایک کرنا پڑتا ہے۔ اہل مدارس اپنے مخصوص نظام تعلیم، اپنے دینی مزاج، اپنی بے سروسامانی، مدارس میں درس وتدریس کا فریضہ انجام دینے والے علماء کرام کی قلت تنخواہ اور ان میں پڑھنے والے طلبہ کی اکثریت کا غربت وافلاس سے جوجھتے خاندان سے متعلق ہونے کی وجہ سے روشن خیال اور تجدد پسند اپنے ہی بھائیوں کی تنقید کا نشانہ بنتے ہیں۔ ان کی تمام تر کوششوں کو بنظر تخفیف دیکھا جاتا ہے۔ یہ بھی اہل مدارس کے لیے ایک بڑا المیہ ہے اور اہل مدارس کے سامنے یہ بھی بڑا چیلنج ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مسلمان ان مدارس کو بنظر تحسین دیکھتے، ان سے متعلق افراد کی حوصلہ افزائی

کرتے اوران مدارس کے کاز کوآگے بڑھانے میں اپنا تعاون پیش کرتے۔ مدارس سے منسلک تمام افراد اہل ایمان اور دین اورانسانیت سے محبت کرنے والے ہوتے ہیں، ان سے کبھی بھی نقض امن کا خطرہ نہیں ہوتا بلکہ وہ کبھی بھی ملک کے لیے خطرہ نہیں بن سکتے۔ وہ انسانیت کے خادم ہوتے ہیں۔

بدقسمتی سے آج ہماری حکومت بھی ان مدارس کو، ان کے نظام تعلیم اوران کے انتظام وانصرام کوشک کی نظر سے دیکھ رہی ہے جو بڑے افسوس اور دکھ کی بات ہے۔ ہم مسلمانوں کو اپنے مدارس کی اہمیت کو سمجھنا چاہیے، دراصل یہی مدارس ہیں جہاں مستقبل کے معمار اور قوم کے مصلح پیدا ہوتے ہیں۔ یہ مدارس مسلم قوم کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر یہ زندہ رہیں گے تو ہم زندہ رہیں گے، ہماری تہذیب زندہ رہے گی، ہم اپنے اقدار کی حفاظت کرسکیں گے، ہمارا ملی تشخص باقی رہے گا۔ مدارس اسلامیہ کا امت مسلمہ پر بڑا احسان ہے، امت کو اس احسان کو سمجھنا چاہیے اور مدارس اسلامیہ کی حفاظت وصیانت کے لیے ہر جتن کرنا چاہیے۔ ہمیں برادران وطن اور ذمہ داران حکومت کو بتانے اور انہیں یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ مدارس اسلامیہ نے ملک وملت کے لیے بے شمار قربانیاں دی ہیں۔ علماء کرام نے ملک کی آزادی میں بے شمار قربانیاں پیش کی ہیں۔ انہیں کی قربانیوں کی بدولت ہمارا ملک ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا۔ ریشمی رومال کی تحریک مدارس سے نکلنے والے علماء نے ہی چلائی تھی۔ انقلاب زندہ باد کا نعرہ بھی علماء کرام نے لگایا تھا۔ انگریزوں کے خلاف علماء نے تقریریں کرکے عوام الناس کو بیدار کیا۔ ہزاروں علماء کرام کو انگریزوں نے جوش انتقام میں پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا اوران علماء کرام نے پورے عزم وحوصلہ اور ہمت وجوانمردی کے ساتھ مسکراتے ہوئے پھانسی کے پھندوں کو قبول کرلیا تب جاکر ہمارے ہندوستان کو آزادی ملی۔

آزادی کے بعد بھی مدارس اور علماء مدارس ملک وملت کی تعمیر، اصلاح معاشرہ اور قیام امن میں اپنا بھرپور رول ادا کرتے رہے ہیں۔ مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ آج ہر میدان میں اپنا نمایاں کردار ادا کررہے ہیں۔ سیاست کا میدان ہو، تجارت کا میدان ہو، تعلیم وتربیت، تصنیف وتالیف، خطابت وتحریر غرضیکہ ہر میدان میں مدارس کے فارغین نمایاں کارنامے انجام دے رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے ملک وملت ترقی وارتقا کی راہ پر گامزن ہے۔ مدارس سے نکلنے والے بہت سارے طلبہ عصری یونیورسٹیوں سے منسلک ہوکر اعلیٰ تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ بہت سارے طلبہ سرکاری عہدوں پر فائز ہوکر ملک کی بڑی بڑی ذمہ داریاں نبھارہے ہیں۔ مدارس میں حب الوطنی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مدارس اسلامیہ سے منسلک علماء وطلبہ، رجال وافراد سچے محب وطن ہوتے ہیں۔ وہ اپنے وطن کے لیے اپنی جان ومال کی قربانی دے دینے کے جذبے سے سرشار ہوکر نکلتے ہیں۔ ہمارے ملک ہندوستان کے اندر مختلف مسلک ومنہج کے ہزاروں مدرسے اپنا تعمیری کردار ادا کرنے میں مشغول ہیں۔ ہر سال ان مدارس سے ہزاروں طلبہ علم وادب کے زیور سے آراستہ ہوکر نکلتے اور ملک کے اندر امن وشانتی کا پیغامبر بن کر اپنی خدمات انجام دیتے ہیں۔

اللہ ان مدارس اسلامیہ کی حفاظت فرمائے اوران کو نظر بد سے بچائے، آمین۔

■■

اسلامی رواداری کے اصول وضوابط

ڈاکٹر عبدالحلیم بسم اللہ مدنی

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين، وعلى آله وصحبه أجمعين، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، وبعد!

اسلام دین فطرت ہے، اس میں سبھی کا احترام ہے، دوسروں کے حقوق کی رعایت ہے۔ اسلام نے اپنے متبعین کو امن وسکون کے ساتھ رہنے کا درس دیا ہے، کسی قوم کا دوسری قوم کے ساتھ مل جل کر امن وسکون کے ساتھ رہنا اس کی دینی اور اخلاقی بلندی کی دلیل ہے۔ اس باب میں دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو رواداری میں حد درجہ غلو کرتے ہیں اور رواداری کے نام پر کفریہ وشرکیہ اعمال برضا ورغبت انجام دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے احکام کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں کرتے۔ دوسرے وہ ہیں جو دین کے نام پر غلو کرتے ہیں، دوسروں کی عزت وناموس، جان ومال حتیٰ کہ ان کے خون سے کھلواڑ کرنے میں ذرہ برابر بھی نہیں ہچکچاتے اور اسلام وسطیت کی تعلیم دیتا ہے کہ انسانی بنیادوں پر غیروں کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے، ان کی عزت وناموس اور جان ومال اور خون سے ہرگز ہرگز کھلواڑ نہ کیا جائے۔

قارئین کرام! رواداری نام ہے طرفین کا ایک دوسرے کی عزت وآبرو، جان ومال، دین اور عقیدے کے احترام کا اور ایک دوسرے کے حقوق کے اعتراف کا اور باہمی الفت ومحبت اور حسن سلوک کے ساتھ رہنے کا۔ اسی لیے اسلام نے تمام انسانوں کو برابری کا درجہ دیا ہے تاکہ تمام لوگ رنگ ونسل مذہب وعقیدہ کے اختلاف کے باوجود آپس میں امن وسکون سے زندگی گزار سکیں۔

چنانچہ نبی ﷺ نے مدینہ پہنچنے کے بعد سب سے پہلے یہودیوں سے امن وسلامتی کے ساتھ رہنے کا معاہدہ کیا اور یہ رواداری کی سب سے پہلی عملی تطبیق ہے کہ اسلام دوسرے ادیان کے متبعین کے ساتھ حسن تعامل کی تعلیم دیتا ہے اور غیروں کی ہرگز نفی نہیں کرتا بلکہ لوگوں کے درمیان دین اور عقیدہ کے اختلاف کو تسلیم کرتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلاَ يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ (ہود: ۱۱۸) اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی راہ پر ایک گروہ کر دیتا وہ تو برابر اختلاف کرنے والے ہی رہیں گے۔

اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ مسلمان کسی بھی حال میں ہو وہ اسلامی رواداری کے اصولوں پر عمل کرے خواہ خوشحالی میں ہو یا تنگدستی میں، خوشی کا موقع ہو یا غم کی حالت ہو، ہر حال میں ان اصولوں پر عمل پیرا ہونا ہے۔ ان میں چند اصول مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔تمام انسان برابر ہیں:

اسلام نے لوگوں کے مابین ہر قسم کی تفریق کو مٹا دیا ہے، چاہے وہ رنگ کی بنیاد پر ہو، یا زبان کی بنیاد پر، یا جنس کی بنیاد پر، تمام انسانوں کو کنگھی کے دانے کی طرح برابر قرار دیا ہے۔ آپس میں کوئی بھی دوسرے سے برتر نہیں الا یہ کہ جو تقویٰ میں بالا و برتر ہو۔ اللہ کا فرمان ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (الحجرات: ۱۳)

اے لوگو ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قبیلوں اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بلاشبہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ علیم وخبیر ہے۔

اور نبی ﷺ نے حجۃ الوداع میں فرمایا: **یا أیها الناس إن ربکم واحد وأباکم واحد**۔ اے لوگو تمہارا رب ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر، کسی کالے کو کسی گورے پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت نہیں سوائے تقویٰ کے۔

بنو آدم سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو اپنی قوم کا بھائی قرار دیا گرچہ وہ دین اسلام کے مخالف تھے۔ اس اخوت سے مراد انسانی اخوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وإلى عاد أخاهم هودا** (الاعراف: ۶۵)

وإلى ثمود أخاهم صالحا (الاعراف: ۷۳)

وإلى مدين أخاهم شعيبا (الاعراف: ۸۵)

اور قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود علیہ السلام کو بھیجا اور قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح علیہ السلام کو بھیجا اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب علیہ السلام کو بھیجا۔

نبی ﷺ خود اور آپ کے صحابہ کرام دوسروں کا احترام کرتے تھے حتیٰ کہ دوسرے مذاہب کے جنازے کے گزرنے کے وقت کھڑے ہو جایا کرتے تھے جیسا کہ عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ بیان کرتے ہیں کہ سہل بن حنیف اور قیس بن سعد رضی اللہ عنہما قادسیہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے پاس سے ایک جنازے کا گزر ہوا، پس دونوں کھڑے ہو گئے۔ ان سے بتایا گیا کہ یہ ذمی کا جنازہ ہے تو ان دونوں نے کہا: نبی ﷺ کے پاس سے ایک جنازے کا گزر ہوا تو آپ کھڑے ہو گئے۔ آپ سے کہا گیا کہ یہ یہودی کا جنازہ ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''**أليست نفسًا**'' کیا یہ جان نہیں ہے۔ (صحیح بخاری: ۱۳۱۲، صحیح مسلم: ۹۶۱)

قارئین کرام! اسلام نے ابتدا ہی سے غیروں کے ساتھ مل کر امن وسکون سے رہنے پر زور دیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سب کو ایک ماں اور ایک باپ (آدم وحوا) سے پیدا کیا لہٰذا آپس میں تفاخر وتفاضل کا کوئی مجال نہیں۔ چنانچہ نبی ﷺ نے اپنی پھوپی زاد بہن زینب بنت جحش قرشیہ ہاشمیہ کی شادی اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے کروا کر اس کا عملی نمونہ پیش فرمایا۔

۲۔لوگوں کے خون، مال وعزت کی حرمت:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (الاسراء: ۷۰)

ہم نے بنوآدم کو معزز بنایا۔

اس طور پر ہر انسان مکرم ہے اور اسے امن کے ساتھ جینے کا حق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی نے انہیں زندگی عطا فرمائی ہے لہٰذا اس حق میں ایک دوسرے میں کوئی فرق نہیں اور نہ ہی کسی رنگ ونسل میں تمیز ہے۔ اسلام تمام اچھے کاموں کا حکم دیتا ہے اور ہر برے کام اور فساد فی الارض سے روکتا ہے۔ اسباب کیسے بھی ہوں اور حالات کتنے ہی نازک ہوں اسلام نے خودکشی کو حرام قرار دیا ہے اور دوسروں کے قتل کو بھی کبیرہ گناہ قرار دیا ہے اور ناحق ایک جان کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

مِنْ أَجْلِ ذَلِكَ كَتَبْنَا عَلَى بَنِيٓ إِسْرَائِيلَ أَنَّهُ مَن قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعاً وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعاً (المائدۃ:۳۲) اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ لکھ دیا کہ جو شخص کسی کو بغیر اس کے کہ وہ کسی کا قاتل ہو یا زمین میں فساد مچانے والا ہو قتل کر ڈالے تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا اور جو شخص کسی ایک کی جان بچا لے اس نے گویا تمام لوگوں کو زندہ کر دیا۔

۳۔عقیدے اور دین کی آزادی:

مذہب اسلام نے ہر انسان کو اپنے من پسند دین وعقیدہ کو اختیار کرنے کی آزادی دی ہے کہ وہ مکمل آزادی کے ساتھ اپنے دینی شعائر کو ادا کریں اور کسی کو مجبور کر کے دین میں لانے سے منع فرمایا ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو منع فرمایا کہ وہ دوسروں کو ایمان لانے پر مجبور نہ کریں، چنانچہ فرمایا:

أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُواْ مُؤْمِنِينَ (یونس:۹۹) تو کیا آپ لوگوں پر زبردستی کر سکتے ہیں یہاں تک کہ وہ مومن ہی ہو جائیں۔

اور فرمایا: فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ (الغاشیۃ:۲۱۔۲۲) پس آپ نصیحت کر دیا کریں کیونکہ آپ صرف نصیحت کرنے والے ہیں آپ ان پر داروغہ نہیں ہیں۔

اور دیگر مومنین کو جبر واکراہ کا معاملہ کرنے سے منع فرمایا، چنانچہ فرمایا: لاإکراہ فی الدین (البقرۃ:۲۵۶)

اس آیت کے شان نزول میں ہے کہ بعض انصاری صحابہ نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے بچوں کو جبراً اسلام میں لائیں حالانکہ وہ دین یہود پر تھے، تو یہ آیت نازل ہوئی اور نبی ﷺ نے لوگوں کو اس سے منع فرما دیا۔

دین اسلام نے دوسروں کے احترام کی تنبیہ کی ہے اور مسلمانوں پر حرام قرار دیا ہے کہ وہ کسی کی شخصیت یا اس کے عقیدے اور اس کے معبود کو گالی دیں تاکہ ردّفعل کے طور پر وہ اللہ رب العالمین کو نہ گالی دینے لگے۔

وَلاَ تَسُبُّواْ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللّهِ فَيَسُبُّواْ اللّهَ عَدْواً بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام:۱۰۸) اور گالی مت دو ان کو جن کی یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں کیونکہ یہ پھر جہالت کی وجہ سے حد سے گزر کر اللہ کو گالی دینے لگیں گے۔

۴۔عدل وانصاف کا قیام:

اسلامی اصول وقواعد میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ دوست دشمن، کمزور اور طاقتور سب کے ساتھ مکمل عدل

وانصاف کیا جائے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ كُونُواْ قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاء لِلّهِ وَلَوْ عَلَى أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالأَقْرَبِيْنَ إِن يَكُنْ غَنِيّاً أَوْ فَقِيْراً فَاللّهُ أَوْلَى بِهِمَا فَلاَ تَتَّبِعُواْ الْهَوَى أَن تَعْدِلُواْ وَإِن تَلْوُواْ أَوْ تُعْرِضُواْ فَإِنَّ اللّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيْرًا (النساء: ۱۳۵) اے ایمان والو! عدل وانصاف پر مضبوطی سے جم جانے والے اور خوشنودیٔ مولا کے لیے سچی گواہی دینے والے بن جاؤ گو وہ خود تمہارے اپنے خلاف ہو یا اپنے ماں باپ کے یا رشتہ دار عزیزوں کے، وہ شخص اگر امیر ہو تو اور فقیر ہو تو دونوں کے ساتھ اللہ کو زیادہ تعلق ہے اس لیے تم خواہش نفس کے پیچھے پڑ کر انصاف نہ چھوڑ دینا اور اگر تم نے کج بیانی یا پہلوتہی کی تو جان لو کہ جو کچھ تم کروگے اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ قریش کو اس عورت نے پریشانی میں ڈال دیا جس نے فتح مکہ میں نبی ﷺ کے زمانے میں چوری کر لی تھی تو انہوں نے کہا کہ نبی ﷺ سے اس کے بارے میں کون شفاعت کرے گا کہ اس کے اوپر ہاتھ کاٹنے کا حد جاری نہ ہو سکے تو لوگوں نے جواب دیا کہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے علاوہ کون جرأت کر سکتا ہے کیونکہ آپ کے نزدیک وہ سب سے زیادہ محبوب ہیں، چنانچہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو تیار کیا گیا پھر انہوں نے نبی، ﷺ سے اس سلسلے میں بات کی۔ یہ سن کر آپ کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا اور فرمایا: اے اسامہ کیا تم اللہ کے حدود میں شفاعت کرتے ہو۔ حضرت اسامہ نے کہا: اے اللہ کے رسول مجھے معاف فرمائیں ایسا دوبارہ نہ ہوگا پھر جب شام کا وقت ہوا تو آپ کھڑے ہوئے اور خطبہ دیا۔ حمد وصلاۃ کے بعد فرمایا: **إنما اهلك الذين قبلكم انهم كانوا إذا سرق فيهم الشريف تركوه وإذا سرق فيهم الضعيف اقاموا عليه الحد وايم الله لو ان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها** (صحیح بخاری: ۳۴۷۵، صحیح مسلم: ۱۶۸۸) تم سے پہلے جو لوگ تھے ان میں اگر کوئی مالدار حسب ونسب والا چوری کرتا تو چھوڑ دیتے اور اگر کوئی کمزور ومسکین چوری کرتا تو اس پر حد نافذ کرتے۔ اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر فاطمہ بنت محمد ﷺ نے بھی چوری کی ہوتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔

پھر آپ نے حکم دیا اور اس عورت کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔

۵۔غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کرنا:

اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ بھی حسن سلوک کی تعلیم دی ہے جو مسلمانوں کے ساتھ امن وسکون سے رہتے ہیں اور جنگ وجدال اور لڑائی جھگڑوں سے دور رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

لَا يَنْهَاكُمُ اللّهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (الممتحنۃ:۸) جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائیاں نہیں لڑیں اور تمہیں جلاوطن نہیں کیا ان کے ساتھ حسن سلوک واحسان کرنے اور بھلے برتاؤ کرنے سے اللہ تمہیں نہیں روکتا بلکہ اللہ تعالیٰ تو انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

یہ آیت کریمہ مسلم معاشرہ میں رہنے والے غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کی اصل اصیل ہے اسی لیے پرامن زندگی گزارنے والے غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کی تمام شکلیں صدقہ، ہدیہ، زیارت وعیادت، صلیہ رحمی اور تعاون جیسی تمام صورتیں جائز اور مطلوب ہیں۔

اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:

وَاللهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ أَخِيْهِ (صحیح مسلم: ۲۶۹۹) کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی مدد اس وقت تک کرتا ہے جب تک کہ بندہ دوسروں کی مدد کرتا ہے۔

اور فرمایا: وفی کل کبد رطبة أجر (صحیح بخاری: ۲۳۶۳، صحیح مسلم: ۲۲۴۴) ہر ذی روح کے ساتھ حسن سلوک میں اجر وثواب ہے۔

قارئین کرام! رواداری کے یہ بعض بنیادی اسلامی اصول وضوابط ہیں جن کی اسلام نے اپنے متبعین کو تعلیم دی ہے اور ایسا کرنے پر انہیں دنیا وآخرت میں اجر وثواب کا مژدہ سنایا ہے۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان اصولوں پر عمل کرنے کی اور ان کی نشر واشاعت کی توفیق بخشے۔ آمین

■ ■

(بقیہ: ماہ ربیع الاول اور ہماری ذمہ داریاں) محبت رسول کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ﷺ کی سنت، آپ کے کردار، آپ کی سیرت اور آپ کی زندگی کو اپنانے کی کوشش کی جائے، آپ کی زندگی ہم مسلمانوں کے لیے بہترین آئیڈیل اور نمونہ ہے۔ ارشاد ربانی ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْراً (سورۂ احزاب: ۲۱) یقیناً تمہارے لیے رسول ﷺ کی زندگی میں عمدہ نمونہ موجود ہے ہر اس شخص کے لیے جو اللہ کی اور قیامت کے دن کی امید رکھتا ہے اور بکثرت اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے۔

ایک مسلمان سچا محب رسول اور متبع سنت اسی وقت ہوسکتا ہے جب وہ آپ ﷺ کی مکمل اقتدا کرنے لگے۔ تمام امور میں آپ ﷺ کی اقتدا ضروری ہے چاہے اس کا تعلق عبادات سے ہو، معاشرت سے، معیشت سے یا سیاست سے ہو۔ اللہ اور اس کے رسول کی سچی محبت ہمارے دلوں میں اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب ہم اپنے ہر عمل میں سنت رسول کو ڈھونڈیں اور ان کو اپنانے کی کوشش کریں۔ قرآن کریم کے اندر اللہ تعالیٰ کی یہ ہدایت واضح لفظوں میں موجود ہے۔

قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيْمٌ (آل عمران: ۳۱) کہہ دیجیے اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو، خود اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرما دے گا اور وہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت کریمہ نے تمام دعویداران محبت کے لیے ایک کسوٹی اور معیار مہیا کر دیا ہے اور وہ ہے اتباع رسول ﷺ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ محبت رسول کے نام پر جو یہ خرافات ایجاد کیے گئے ہیں ان کا سد باب کیا جائے اور نبی ﷺ کی تعلیمات پر عمل کر کے جنت کا حقدار بننے کی کوشش کی جائے نیز من گھڑت باتوں سے اجتناب کر کے جہنم کا ایندھن بننے سے بھی بچا جائے۔ اللہ ہمیں سنت کے اتباع کرنے اور بدعات وخرافات سے اجتناب کرنے کی توفیق دے۔ آمین ■

سنن رواتب کے احکام ومسائل

ڈاکٹر عبدالصبور ابوبکر مدنی

چوتھی قسط (گزشتہ سے پیوستہ)

وتر کی نماز:

وتر کی نماز سنت مؤکدہ اور ان نفلی نمازوں میں سے ہے جن کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سفر وحضر میں اہتمام کیا کرتے تھے۔

وتر کے بعض احکام ومسائل درج ذیل ہیں:

نمازِ وتر کی اہمیت:

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعًا روایت کرتے ہیں: "يا أهل القرآن أوتروا، فإن الله وتر، ويحب الوتر" (۱۲۳)۔

''اے اہل قرآن! وتر پڑھو، کیونکہ اللہ تعالی وتر ہے اور وہ وتر کو پسند فرماتا ہے''۔

اللہ وتر ہے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی اپنی ذات وصفات میں یکتا وتنہا ہے اس کا کوئی مثل نہیں ہے، اسی طرح اپنے افعال میں بھی وہ یکتا ہے، کوئی اس کا مددگار اور شریک نہیں ہے (۱۲۴)۔

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "أوتروا قبل أن تصبحوا" (۱۲۵)

''صبح ہونے سے پہلے وتر پڑھو''۔

خارجہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: "إنّ الله أمدّكم بصلاة هي خير لكم من حمر النّعم، الوتر" (۱۲۶)

''اللہ تعالی نے تمہاری ایک ایسی نماز کے ذریعہ مدد فرمائی ہے جو سرخ اونٹوں سے بہتر ہے یعنی نماز وتر''۔

وتر کی اہمیت کی وجہ سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر حال میں اسے پڑھنے کی ترغیب دی ہے۔

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَن نام عن وتره أو نسيه فليصله إذا ذكره" (۱۲۷)

''جو وتر کی نماز سے سو جائے یا بھول جائے تو اسے چاہیے کہ جب یاد آئے پڑھ لے''۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے کہا: "كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يوتر على راحلته" (۱۲۸)

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری پر وتر کی نماز پڑھتے تھے''۔

معلوم ہوا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نماز وتر کا سفر میں بھی اہتمام فرماتے تھے۔

وتر کا حکم:

محدثین اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک وتر سنت ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک واجب ہے جب کہ ان کے شاگرد امام ابو یوسف اور امام محمد نے اسے سنت قرار دیا ہے، چنانچہ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں: "وقالا: سنة؛ لظهور آثار السنن فيه؛ حيث لا يكفر جاحده، ولا يؤذّن له" (۱۲۹)

''ان دونوں (ابو یوسف ومحمد) نے وتر کو سنت کہا ہے کیوں کہ سنت کے علامات اس میں ظاہر ہیں بایں طور پر کہ وتر کے منکر کو کافر نہیں کہا جاتا ہے اور نہ ہی اس کے لیے اذان کہی جاتی ہے''۔

اس مسئلہ میں جمہور اہل علم کا قول راجح ہے، جس کی متعدد دلیلیں ہیں:

پہلی دلیل:

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: "سأل رجلٌ رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: يا رسول الله، كم افترض الله عز وجل على عباده من الصلوات؟ قال: "افترض الله على عباده صلوات خمسًا. « قال: يا رسول الله، هل قبلهنّ أو بعدهنّ شيئًا؟ قال: "افترض الله على عباده صلوات خمسًا. «فحلف الرجل لا يزيد عليه شيئًا ولا ينقص منه شيئًا. قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "إن صدق ليدخلن الجنة" (۱۳۰)

''ایک شخص نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! اللہ تعالی نے اپنے بندوں پر کتنی نمازیں فرض کی ہیں؟ فرمایا: اللہ نے اپنے بندوں پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! ان کے پہلے اور بعد میں بھی کوئی نماز فرض ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ نے اپنے بندوں پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اس آدمی نے قسم کھائی کہ وہ ان پر نہ کچھ اضافہ کرے گا اور نہ کچھ کمی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یہ سچا ہے تو ضرور جنت میں داخل ہوگا''۔

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کو خبر دی کی بندوں پر صرف پانچ نمازیں فرض ہیں، ان کے علاوہ کوئی نماز فرض نہیں ہے جسے ترک کرنے پر کوئی گناہ ہو۔ لہٰذا اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وتر واجب نہیں ہے۔

دوسری دلیل:

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان سے ذکر کیا گیا کہ ایک شخص وتر کو واجب کہتا ہے تو انہوں نے کہا: "كذب، أشهد أني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: "خمس صلوات افترضهن الله تعالى" (۱۳۱)

''اس نے جھوٹ بولا، میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالی نے صرف پانچ نمازیں فرض کی ہیں''۔

تیسری دلیل:

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ حکم دے کر یمن بھیجا کہ وہاں کے لوگوں کو بتادیں: "أن الله قد افترض عليهم خمس صلوات في كل يوم وليلة" (۱۳۲)

''اللہ تعالی نے دن ورات میں ان پر پانچ نمازوں کو

فرض کیا ہے''۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ عمدہ ترین دلیلوں میں سے ہے کیوں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے کچھ قبل معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تھا'' (۱۳۳)۔

چوتھی دلیل:

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "**الوتر ليس بحتم كصلاتكم المكتوبة، ولكن سن رسول الله صلى الله عليه وسلم وقال: إن الله وتر، يحب الوتر، فأوتروا يا أهل القرآن**" (۱۳۴)

''وتر فرض نمازوں کی طرح لازم نہیں ہے، لیکن اسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ نے سنت قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اللہ یکتا ہے اور یکتائی کو پسند کرتا ہے لہٰذا اے اہل قرآن! وتر کی نماز پڑھو''۔

یہ روایت وتر کی عدم فرضیت کے لیے نص صریح ہے۔

نافع سے مروی ہے انہوں نے کہا: "**كان ابن عمر رضي الله عنهما يصلي على راحلته ويوتر عليها، ويخبر أن النبي صلى الله عليه وسلم كان يفعله**" (۱۳۵)

''ابن عمر رضی اللہ عنہما سواری پر نفل نماز اور وتر پڑھتے تھے اور کہتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا کرتے تھے''۔

یہ حدیث وتر کے عدم وجوب کی واضح دلیل ہے کیوں کہ اگر یہ نماز واجب ہوتی تو سواری پر اس کا پڑھنا کافی نہ ہوتا۔

امام بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "**أجمع أهل العلم على أن الوتر ليس بفريضة، وهو سنة عند عامتهم**" (۱۳۶)

''اہل علم کا اجماع ہے کہ وتر فرض نہیں ہے اور وہ عام لوگوں کے نزدیک سنت ہے''۔

امام غزالی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "**الوتر سنة مؤكدة، وليس بفرض ولا واجب وبه قالت الأمة كلها إلا أبا حنيفة**" (۱۳۷)

''وتر سنت مؤکدہ ہے، فرض اور واجب نہیں ہے اور یہی ساری امت کا قول ہے سوائے ابوحنیفہ کے''۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: "**الوتر سنة مؤكدة باتفاق المسلمين، ومن أصر على تركه فإنه ترد شهادته**" (۱۳۸)

''وتر تمام مسلمانوں کے نزدیک متفقہ طور پر سنت مؤکدہ ہے اور جو اسے لگاتار چھوڑتا ہے اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی''۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "**والحق أن الوتر سنة، هو أوكد السنن، بينه علي، وابن عمر، وعبادة بن الصامت رضي الله عنهم**" (۱۳۹)

''صحیح یہ ہے کہ وتر سنت ہے اور وہ سنتوں میں سب سے زیادہ تاکیدی سنت ہے جیسا کہ علی، ابن عمر اور عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہم نے بیان فرمایا ہے''۔

وتر کا وقت:

وتر کا وقت نماز عشاء کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور طلوع فجر کے وقت ختم ہوتا ہے۔

خارجہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**إن الله أمدكم**

بصلاة هي خير لكم من حمر النعم، الوتر، جعله الله لكم فيما بين صلاة العشاء على أن يطلع الفجر" (۱۴۰)

''اللہ تعالی نے تمہاری ایک ایسی نماز کے ذریعہ مدد فرمائی ہے جو تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے اور وہ نمازِ وتر ہے جس کا وقت نماز عشاء سے لے کر طلوع فجر تک ہے''۔

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " أوتروا قبل أن تصبحوا" (۱۴۱)

''صبح کرنے سے پہلے وتر پڑھو''۔

نمازِ وتر کے مذکورہ وقت پر اہل علم کا اجماع ہے۔

ابن منذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "أجمع أهل العلم على أن ما بين صلاة العشاء إلى طلوع الفجر وقت للوتر" (۱۴۲)

''یعنی اس امر پر اہل علم کا اجماع ہے کہ عشاء کی نماز سے لے کر طلوع فجر تک کا وقت وتر کی نماز کا وقت ہے''۔

ابن رشد رحمہ اللہ نے کہا: "اتفقوا على أنّ وقته بعد صلاة العشاء إلى طلوع الفجر" (۱۴۳)

''لوگوں کا اس پر اتفاق ہے کہ وتر کا وقت عشاء کی نماز کے بعد سے طلوع فجر تک جاری رہتا ہے''۔

عشاء کی نماز کے بعد رات کے کسی بھی وقت میں وتر کی نماز ادا کی جاسکتی ہے۔

عبداللہ بن ابی قیس سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: "ربما أوتر أول الليل، وربما أوتر من آخره" (۱۴۴)

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی رات کے ابتدائی حصہ میں وتر پڑھتے تھے اور کبھی شب کے آخری حصہ میں''۔

ایک روایت میں عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: "من كل الليل قد أوتر رسول الله صلى الله عليه وسلم من أول الليل، وأوسطه، وآخره، فانتهى وتره إلى السحر" (۱۴۵)

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے ہر حصہ میں وتر کی نماز پڑھی ہے، ابتدائے شب میں، درمیان میں، آخر میں، پھر آپ کے وتر کی نماز سحری کے وقت تک پہنچ گئی''۔

امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: "فيه جواز الإيتار في جميع أوقات الليل بعد دخول وقته" (۱۴۶)

''اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وتر کا وقت داخل ہونے کے بعد رات کے ہر حصہ میں وتر پڑھنا جائز ہے''۔

معلوم ہوا کہ وتر عشا کی نماز کے تابع ہے، جمہور اہل علم کے نزدیک عشاء سے قبل وتر پڑھنا جائز نہیں ہے، اگر کوئی عشا کی نماز سے قبل پڑھ لے چاہے جان بوجھ کر یا بھول کر تو اسے اعادہ کرنا ہوگا (۱۴۷) اور اگر کوئی طلوع فجر کے بعد وتر کی نماز پڑھے تو وہ جائز ہے۔ اس کا بیان آگے آرہا ہے۔ ان شاء اللہ۔

وتر کا افضلِ وقت:

وتر کے افضل وقت کے بارے میں اہل علم کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اولِ وقت میں

پڑھنا افضل ہے اور بعض نے کہا کہ آخری وقت میں۔ اور دونوں اوقات کے لیے حدیثیں وارد ہیں اور ان کی تایید آثار صحابہ سے ہوتی ہے:

پہلے قول کی دلیل:

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: "أوصاني خليلي صلى الله عليه وسلم بثلاث: صيام ثلاثة أيام من كل شهر، وركعتي الضحى، وأن أوتر قبل أن أنام" (۱۴۸)

''مجھے میرے خلیل صلی اللہ علیہ وسلم نے تین باتوں کی وصیت کی ہے: ہر مہینے میں تین دن کا روزہ رکھنا، چاشت کی دو رکعت نماز پڑھنا، اور سونے سے قبل وتر کی نماز پڑھنا''۔

دوسرے قول کی دلیل:

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے کہا: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي من الليل حتى يكون آخر صلاته الوتر" (۱۴۹)

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم رات کی نماز پڑھتے رہتے یہاں تک کہ آپ کی آخری نماز وتر ہوتی''۔

ایک دوسری روایت میں عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''كان النبي صلى الله عليه وسلم يصلي وأنا راقدة، معترضة على فراشه، فإذا أراد أن يوتر أيقظني فأوترت'' (۱۵۰)

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کی نماز پڑھتے اور میں آپ کے بستر پر سوئی رہتی یہاں تک کہ جب آپ وتر پڑھنے کا ارادہ کرتے تو مجھے بیدار کرتے اور میں بھی آپ کے ساتھ وتر پڑھتی''۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اجعلوا آخر صلاتكم بالليل وترًا'' (۱۵۱) تم رات کی اپنی آخری نماز وتر کو بناؤ۔

عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں: "من كل الليل قد أوتر رسول الله صلى الله عليه وسلم فانتهى وتره إلى السحر" (۱۵۲)

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے تمام حصوں میں وتر کی نماز پڑھی۔ پھر آپ کی وتر کی نماز سحر کے وقت تک پہنچ گئی''۔

ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں اوقات دو طرح کے لوگوں کے لیے ہیں چنانچہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "من خاف أن لا يقوم من آخر الليل فليوتر أوله، ومن طمع أن يقوم آخره فليوتر آخر الليل، فإن صلاة آخر الليل مشهودة، وذلك أفضل" (۱۵۳)

''جسے اندیشہ ہو کہ رات کے آخری حصہ میں نہیں اٹھ سکے گا تو اسے چاہیے کہ اول شب میں وتر پڑھ لے اور جسے امید وشوق ہو کہ آخر رات میں بیدار ہو جائے گا تو آخر شب میں وتر پڑھے کیوں کہ آخر رات کی نماز میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور وہ افضل ہے''۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ درست بات یہ ہے کہ جو شخص تہجد کی نماز کے لیے بیدار ہوتا ہے اس کے حق میں وتر کو مؤخر کرنا افضل ہے اسی طرح اس کے لیے بھی تاخیر کرنا افضل ہے جو تہجد نہیں پڑھتا مگر اسے یقین ہے کہ وہ خود یا کسی کے بیدار کرنے پر جاگ جائے گا اور جسے اس پر بھروسہ نہ ہو اس کے لیے پہلے پڑھنا افضل ہے (۱۵۴)۔

وتر کی قضا:

وتر کی قضا کے بارے میں اہل علم کے درمیان شدید اختلاف ہے۔حنفیہ کے نزدیک وتر کی قضا واجب ہے اور بعض لوگوں کے نزدیک فجر جب طلوع ہوجائے تو وتر کا وقت ختم ہوجاتا ہے اور اس کی قضا نہیں ہے اور شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک وتر کی قضا جائز ہے اور یہی قول راجح ہے۔

دلیل:

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "من نام عن الوتر أو نسيه فليصل إذا ذكر وإذا استيقظ" (۱۵۵)

''جو وتر کی نماز سے سو جائے یا بھول جائے تو اسے چاہیے کہ جب یاد آئے یا جب بیدار ہو پڑھ لے''۔

عبداللہ بن زید بن اسلم عن ابیہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " من نام عن وتره فليصل إذا أصبح" (۱۵۶)

''جو وتر کی نماز سے سو جائے تو اسے چاہیے کہ صبح کے وقت پڑھ لے''۔

ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سونے اور بھولنے پر وتر کی قضا ہے،لیکن ان سے استدلال پر اعتراض کیا گیا ہے کیوں کہ پہلی حدیث کی سند میں عبدالرحمن بن زید بن اسلم ہیں جو ضعیف ہیں اور دوسری سند مرسل ہے، زید بن اسلم تابعی ہیں۔لیکن اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ عبدالرحمن بن زید اگرچہ ضعیف ہیں،احمد،ابن معین،ابوحاتم رازی وغیرہ (۱۵۷) نے تضعیف کی ہے مگر ابوداود (۱۵۸) کی روایت میں محمد بن مطرف ابوغسان مدنی نے ان کی متابعت کی ہے اور وہ ثقہ راوی ہیں مزید یہ کہ عبداللہ بن زید کی توثیق احمد اور ابن مدینی نے کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے والد زید سے اس روایت کو لیا ہے اور ابو داود کی حدیث کی سند کو نووی نے حسن کہا ہے (۱۵۹)۔

شوکانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: " وإسناد الطريق التي أخرجه منها أبوداود صحيح كما قال العراقي" (۱۶۰)

''جس طریق سے ابوداود نے حدیث کی تخریج کی ہے اس کی سند صحیح ہے جیسا کہ عراقی نے کہا ہے''۔

خلاصہ کلام: مذکورہ روایت قابل حجت ہے اور اس کی تایید شریعت کے عام اصولوں سے بھی ہوتی ہے کہ بھولنے اور سونے کو عذر شرعی مانا گیا ہے اور ان کی وجہ سے بہت سارے احکام میں تخفیف اور آسانی کی گئی ہے، خاص طور پر نماز کے لیے نص شرعی موجود ہے چناں چہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "من نسي صلاة فليصلها إذا ذكرها، لا كفارة لها إلا ذلك. قال قتادة: وَأَقِمِ ٱلصَّلَوٰةَ لِذِكرِيٓ" (۱۶۱)۔

بلاشبہ یہاں لفظ ''صلاۃ'' کے عموم میں وتر کی نماز بھی داخل ہے۔ اس قول کو صحابہ کرام کے آثار سے بھی تقویت ملتی ہے، عراقی رحمہ اللہ نے وتر کی قضا کے جواز کو دس صحابہ کرام سے نقل کیا ہے اور وہ ہیں: علی، سعد بن ابی وقاص، ابن مسعود، ابن عمر، عبادہ بن صامت، عامر بن ربیعہ، ابو الدرداء، معاذ بن جبل، فضالہ بن عبید اور ابن عباس رضی اللہ عنہم (۱۶۲)۔

(جاری)

حواشی:

(۱۲۳) سنن ابی داود (2/557 رقم 1416)، سنن النسائی (3/228 رقم 1675)، سنن ابن ماجہ (1/370 رقم 1169)، مسند احمد (2/223 رقم 877)۔ یہ حدیث حسن ہے۔ اس کی سند میں عاصم بن ضمرہ سلولی ہے جو صدوق ہے۔ دیکھیے: تقریب التہذیب (3063)۔

(۱۲۴) مطالع الانوار علی صحاح الآثار ، ابن قرقول (6/167)۔

(۱۲۵) صحیح مسلم (1/519 رقم 754)۔

(۱۲۶) سنن الترمذی (1/469 رقم 452)، شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو بجز قولہ "**هي خير لكم من حمر النعم**" صحیح کہا ہے۔

(۱۲۷) اس کی تخریج آگے آرہی ہے۔

(۱۲۸) صحیح مسلم (1/486 رقم 700)۔

(۱۲۹) الہدایہ (1/66)۔

(۱۳۰) سنن النسائی (1/228 رقم 459)، مسند احمد (21/332 رقم 13815)۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

(۱۳۱) سنن ابی داود (1/317 رقم 425)، سنن نسائی (1/230 رقم 461)، امام نووی رحمہ اللہ نے مجموع (4/20) میں کہا: "**هذا حديث صحيح**"۔

(۱۳۲) صحیح مسلم (1/50 رقم 19)۔

(۱۳۳) المجموع (4/20)۔

(۱۳۴) سنن الترمذی (1/470 رقم 453)، سنن النسائی (3/229 رقم 1676) مختصرًا، مسند احمد (2/396 رقم 1232)۔ یہ حدیث قابل استدلال ہے، امام ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔

(۱۳۵) صحیح البخاری (3/44 رقم 1095)۔

(۱۳۶) شرح السنہ (4/102)۔

(۱۳۷) دیکھیے: المجموع للنووی (4/19)۔

(۱۳۸) مجموع الفتاوی (23/88)۔

(۱۳۹) حجۃ اللہ البالغہ (2/28)۔

(۱۴۰) اس کی تخریج گزر چکی ہے۔

(۱۴۱) اس کی تخریج گزر چکی ہے۔

(۱۴۲) الاوسط (5/190)۔

(۱۴۳) بدایۃ المجتہد (1/211)۔

(۱۴۴) سنن ابی داود (2/573 رقم 1437)، سنن الترمذی (5/44 رقم 2924)، صحیح ابن خزیمہ (2/144 رقم 1081)، ترمذی نے اسے حسن غریب کہا ہے۔

(۱۴۵) صحیح مسلم (1/512 رقم 745)۔

(۱۴۶) شرح النووی علی مسلم (6/24)۔

(۱۴۷) دیکھیے: بدائع الصنائع (1/272)، مجموع (3/469)، مغنی (3/162)، شرح الخرشی (1/10)۔

(۱۴۸) صحیح البخاری (3/41 رقم 1981)، صحیح مسلم (1/499 رقم 721)۔

(۱۴۹) صحیح مسلم (2/167 رقم 740)۔

(۱۵۰) صحیح البخاری (1/109 رقم 512)، صحیح مسلم (1/366 رقم 512)۔

(۱۵۱) صحیح البخاری (2/25 رقم 998)، صحیح مسلم (1/518 رقم 751)۔

(۱۵۲) صحیح البخاری (2/25 رقم 996)، صحیح مسلم

(1/512 رقم745)۔
(۱۵۳) صحیح مسلم (2/174 رقم755)۔
(۱۵۴) المجموع (15-4/14)۔
(۱۵۵) سنن الترمذی (1/480 رقم465)، سنن ابن ماجہ (2/259 رقم1188) بطریق عبدالرحمن بن زید بن اسلم عن ابیہ عن عطاء بن یسار عن ابی سعید الخدری عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ عبدالرحمن بن زید ضعیف ہے لیکن سنن ابی داود (2/2570 رقم1431) میں اس کی ابوعثمان محمد بن مطرف مدنی نے متابعت کی ہے اور وہ ثقہ ہیں، لہذا یہ حدیث صحیح ہے۔
(۱۵۶) سنن الترمذی (1/480 رقم466) اس کی سند صحیح ہے لیکن مرسل ہے۔
(۱۵۷) دیکھیئے: الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم (5/233 قم1107)۔
(۱۵۸) سنن ابی داود (2/570 رقم1431)۔
(۱۵۹) دیکھیے: المجموع (4/42)۔
(۱۶۰) نیل الاوطار (3/59)۔
(۱۶۱) صحیح مسلم (1/477 رقم684)۔
(۱۶۲) دیکھیے: نیل الاوطار (3/59)۔ ■■

(بقیہ صفحہ) ۴۶

عبدالجبار (مؤذن صاحب) اب دنیا میں نہیں رہے

انتہائی رنج وغم کے ساتھ اطلاع دی جارہی ہے کہ جامعہ سلفیہ بنارس کے سابق مخلص خادم جناب عبدالجبار صاحب کا جو کہ مؤذن صاحب سے مشہور تھے طویل علالت کے بعد بتاریخ 6 ستمبر 2022م بروز منگل بعد نماز مغرب انتقال ہوگیا۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واجعل مثواہ الجنۃ۔**

آپ صوم وصلوۃ کے پابند، امانت دار، نیک اور شریف انسان تھے۔ آپ جامعہ سلفیہ بنارس کے سب سے قدیم اور بہت ہی مخلص وخیر خواہ خادم تھے آپ 1966م میں بقرعید سے پہلے ہی جامعہ میں ملازم کی حیثیت بحال ہوگئے تھے جب کہ جامعہ میں بقرعید کے بعد تعلیم شروع ہوئی تھی۔ واقعی مؤذن صاحب رحمہ اللہ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے جن کا اعتراف جامعہ کے ذمہ داران، اساتذہ وفارغین ہر کسی کو ہے۔ بقول محترم ناظم اعلیٰ صاحب حفظہ اللہ عبدالجبار دا جیسا مخلص خادم اب جامعہ میں کوئی نہیں آیا۔ نمازِ جنازہ 7 ستمبر 2022م بروز بدھ بعد نماز ظہر دو بجے مدرسہ بیت العلوم، چورای، جونپور میں محترم ناظم اعلیٰ فضیلۃ الشیخ عبداللہ سعود صاحب سلفی حفظہ اللہ کی امامت میں ادا کی گئی۔ جنازہ وتدفین میں جامعہ سلفیہ بنارس کے فارغین اور علمائے کرام حفظھم اللہ کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ جامعہ سے محترم ناظم اعلیٰ کے ساتھ درج ذیل اساتذہ کرام وغیرہم نے جنازہ میں شرکت کی: مولانا محمد عبدالقیوم مدنی، مولانا اسعد اعظمی، مولانا محمد انس مکی، مولانا محمد ایوب سلفی، مولانا ابوصالح دل محمد سلفی اور غیر تدریسی عملہ میں مولانا معین الدین سلفی، حافظ محفوظ الرحمن سلفی، ماسٹر فیاض احمد، ڈرائیور مرتضیٰ، عبدالرشید، خالد، ممتاز وغیرہم۔ رب کریم عبدالجبار صاحب رحمہ اللہ کے جملہ نیک اعمال کو قبول فرمائے، ان کی بشری لغزشوں کو درگذر فرمائے، اور انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ واپسی میں مولانا کلیم اللہ صاحب سلفی کی دعوت پر ان کے گھر میں چائے پانی کے بعد جامعہ کی شاخ مدرسہ چشمہ حیات، رہٹی، جونپور کا معائنہ بھی عمل میں آیا۔ محترم ناظم اعلیٰ صاحب حفظہ اللہ نے اس ادارہ کو تعلیمی وتربیتی اعتبار سے مزید منظم ومستحکم کرنے کے لئے مناسب وضروری ہدایات دیتے ہوئے وہاں کے ذمہ داروں سے کہا کہ ادارے کو ترقی دینے کے ضرورت ہے۔

آثار صالحین سے تبرک کی شرعی حیثیت

طارق اسعد
جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

دین اسلام ایک آسان اور سادہ مذہب ہے جو ہر قسم کے بے جا تکلفات اور پیچیدگیوں سے خالی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ''**إن الدين يسر**'' (بخاری:۳۹) دین آسان ہے۔ چنانچہ مذہب اسلام کو سادہ اور آسان بنا کر شارع نے متبعین سے ان تکلیف دہ چیزوں کو ہٹا دیا جن کی وہ استطاعت نہیں رکھتے اور اس سادگی کے اہتمام اور بقا کی خاطر دین میں ہر اس راستے کو بند کر دیا جس سے کوئی بھی نیا عمل اس میں داخل ہو سکے۔ ''**من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد**'' (بخاری:۲۶۹۷) جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کی جو اس میں نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔

مذہب اسلام کی اس سادگی اور آسانی کے باوجود کچھ بدعتی طبقوں نے اس میں زہر آزمائی کی کوشش کی اور شریعت کے مقرر کردہ آسان راستوں کو نظر انداز کر کے حصول ثواب کی خاطر دور دراز کے ایسے نت نئے طریقے ڈھونڈ نکالے جن پر عمل کرنا نہ صرف دشوار گذار ہے بلکہ ان کا شریعت مطہرہ سے دور دور تک کوئی واسطہ بھی نہیں۔ یہ طریقے بظاہر تو بہت ہی خوشنما اور دلفریب لگتے ہیں مگر درحقیقت ان میں پوشیدہ حقائق کی شناعت وقباحت پر اگر غور کیا جائے تو ان میں شرکیہ اعمال کی بو بھی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ ان فروعی مسائل میں امت کے ایک طبقے کو اس طرح الجھا دیا گیا کہ دین کے اصل اور بنیادی معاملہ ان سے اوجھل ہو گئے اور اب یہ طبقہ اصل دین کو چھوڑ کر اسی میں شاداں وفرحاں ہے۔ **كل حزب بما لديهم فرحون**۔ (الروم:۳۲)

ان مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ آثار صالحین سے تبرک کا ہے۔ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ زیر نظر مضمون میں ان شاء اللہ ہم اس کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

تبرک کا معنی:

تبرک ''برکت'' سے ماخوذ ہے۔ لغت میں برکت کا معنی ہے: نمو، اضافہ، سعادت۔ (القاموس المحیط از فیروزآبادی، مادہ ''برک'')

اصطلاحی تعریف میں علامہ ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''**إن البركة كثرة الخير و دوامه**'' (**بدائع الفوائد لابن القيم ۲/ ۱۸۴**)

''برکت کہتے ہیں خیر کی فراوانی اور اس کے دوام کو''

اسی سے ''تبرک'' باب تفعل کا مصدر ہے: برکت طلب کرنا، برکت چاہنا۔

قرآن و حدیث کا مطالعہ کریں تو جابجا اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ برکت اور اس کی تمام انواع اللہ کی جانب سے ہیں۔ جیسے: ''تبارك الذي بيده الملك''

(الملک:۱) اور ''وبارکنا علیه وعلی إسحاق'' (الصافات:۱۱۳) وغیرہ۔

اسی طرح بعض ایام اور مقامات کو اللہ نے متبرک بنایا ہے جیسے بیت اللہ الحرام، مکہ مکرمہ، مساجد، ماہ رمضان، عشرہ ذی الحجہ، یوم عرفہ اور یوم جمعہ وغیرہ۔ نیز بنی آدم میں سے بعض اہل ایمان کو متبرک بنایا ہے۔ شیخ صالح بن عبدالعزیز لکھتے ہیں: ''انبیاء ورسل کی ذات بابرکت ہے، یعنی ان کے اجسام مبارک ہیں۔ اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کے جسم کو مبارک بنایا۔ حضرت ابراہیم، نوح، عیسی اور موسیٰ علیہ السلام کے اجسام کو مبارک بنایا۔'' (التمهيد لشرح كتاب التوحيد از شیخ صالح بن عبدالعزیز، ص:۱۲۵)

واضح رہے کہ وہ اشیاء، اقوال اور افعال جن کو شریعت نے متبرک ٹھہرایا ہے وہ محض برکت کا سبب ہیں نہ کہ بذات خود برکت دینے والی ہیں۔

صحابہ کرام کا نبی ﷺ کی ذات اور آپ کی دیگر اشیاء سے تبرک:

نبی مقدس ﷺ کی حیات مبارکہ میں صحابہ کرام آپ ﷺ کی ذات اور دیگر اشیاء جیسے موئے مبارک، ریق مبارک اور وضو کے بچے پانی سے تبرک حاصل کیا کرتے تھے۔ اس تعلق سے بہت ساری حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔ ذیل میں چند احادیث ذکر کی جارہی ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ نبی ﷺ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے یہاں تشریف لے گئے اور بستر پر سو گئے۔ ام سلیم آئیں اور دیکھا کہ آپ کو پسینہ آرہا ہے اور بستر کے ایک حصہ پر پسینے کے قطرات جمع ہو گئے۔ چنانچہ وہ ایک شیشی لے آئیں اور آپ کے پسینے کے قطرات جمع کرنے لگیں۔ اسی دوران آپ بیدار ہو گئے اور پوچھا کہ ام سلیم کیا کر رہی ہیں؟ کہا ان مبارک قطرات میں ہم اپنے بچوں کے لیے برکت کے امید وار ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا درست ہے۔ (مسلم:۲۳۳۱)

عروہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ''۔۔۔۔۔ فو الله ما تنخم رسول الله ﷺ نخامة إلا وقعت في كف رجل منهم فدلك بهما وجهه و جلده۔۔ الحدیث'' (بخاری:۲۷۳۱)

اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ کے منہ سے بلغم نہیں نکلتا مگر وہ صحابہ میں سے کسی کے ہاتھ پر پڑتا اور وہ اس سے اپنے چہرے اور جلد پر ملتا تھا۔

ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: '' خرج علينا رسول الله ﷺ بالهاجرة، فأتي بوضوء فتوضأ، فجعل الناس يأخذون من فضل وضوئه، فيتمسحون به۔'' (بخاری:۱۸۷)

رسول اللہ ﷺ ہمارے یہاں سخت گرمی میں دوپہر کے وقت تشریف لائے، آپ کے پاس وضو کا پانی لایا گیا تو آپ نے وضو کیا۔ لوگ آپ کے وضو کے پانی کو لینے لگے اور اس کو اپنے اوپر ملنے لگے۔

آپ کی ذات سے تبرک کا یہ سلسلہ صرف آپ کی حیات تک ہی محدود نہیں تھا۔ صحابہ اور تابعین آپ کی وفات کے بعد بھی آپ ﷺ کے آثار سے تبرک حاصل کرتے تھے۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما نے ایک مرتبہ

ایک سیاہ جبہ نکالا اور کہا'' یہ حضرت عائشہ کے پاس تھا یہاں تک کہ ان کی وفات ہوگئی۔ ان کی وفات کے بعد اسے میں نے لے لیا۔ نبی ﷺ اسے پہنتے تھے۔ ہم شفا حاصل کرنے کے لیے اس سے مریضوں کو غسل دیتے ہیں۔(مسلم:۲۰۶۹)

ابن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:'' میں نے عبیدہ سے کہا کہ ہمارے پاس نبی ﷺ کا بال ہے جسے ہم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے یہاں سے پایا ہے۔ میرے پاس اس بال کا ہونا میرے لیے دنیا وما فیہا سے بہتر ہے۔''(بخاری:۱۷۰)

اس کے علاوہ اور بھی بہت سارے دلائل ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام آپ کی زندگی میں اور آپ کے بعد آپ کے آثار سے برکت حاصل کیا کرتے تھے،لیکن بخوف طوالت ہم انہیں پس انداز کررہے ہیں۔

غیر نبی کے آثار سے تبرک:

مذکورہ بالا دلائل سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ تبرک کی یہ شکل صرف نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص ہے ،کیوں کہ آپ کی ذات جس تقدس کی حامل ہے وہ کسی صاحب نظر سے مخفی نہیں۔آپ تمام بنی نوع انسان میں سب سے پاکیزہ ،سب سے مقدس اور سب سے متبرک ہیں۔ چنانچہ شریعت نے اس متبرک ہستی کے آثار سے تبرک کو جائز ٹھہرایا۔لیکن اس امر پر کسی اور ذات کو قیاس کرکے اس کے آثار سے تبرک کی مشروعیت کا استدلال کرنا یہ قیاس مع الفارق ہے۔ نبی کے تقدس اور عظمت کی وجہ سے ان کی ذات یا آثار سے تبرک کی مشروعیت کا پتہ چلتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ نبی ﷺ کی ذات جس جلیل القدر منصب پر فائز ہے اس تک کوئی بھی بشر نہیں پہنچ سکتا۔ پھر کیوں کر نبی کے علاوہ دوسرے اولیاء وصالحین کے آثار سے تبرک جائز ہوسکتا ہے۔ڈاکٹر ناصر بن عبدالرحمن''التبرک :أنواعه و أحكامه''میں لکھتے ہیں:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی ﷺ کی اس تبرک کے ساتھ خصوصیت،اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ صالحین کو آپ پر قیاس نہیں کیا جائے گا اور یہ کہ یہ چیز آپ کے ساتھ مخصوص ہے دوسروں کے لیے نہیں۔علما کا اس بات پر اجماع ہے کہ جب نبی کے حق میں کوئی خصوصیت ثابت ہوجائے تو وہ اس بات کی متقاضی ہے کہ دوسروں کا حکم آپ جیسا نہیں، کیوں کہ یہ حکم اگر غیر کو بھی شامل ہوجائے تو پھر اختصاص کا کوئی معنی ہی نہیں رہ جاتا۔''

(التبرک أنواعه وأحكامه از ڈاکٹر ناصر بن عبدالرحمن، ص:۲۶۶)

اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ صحابہ کرام جو آپ کی حیات مبارکہ میں آپ کی مختلف چیزوں سے تبرک حاصل کیا کرتے تھے،آپ کی وفات کے بعد آپ کے آثار کے علاوہ کسی چیز سے بھی تبرک نہیں حاصل کیا۔ نہ تو کسی مفضول صحابی نے افضل صحابی سے ،نہ صحابی صغیر نے کبیر سے، نہ تابعین نے صحابہ سے، نہ صحابہ نے خلفاء راشدین سے، نہ تو ان کی ذات سے اور نہ ہی ان کے آثار سے کبھی تبرک حاصل کیا۔ حالاں کہ صحابہ کی جماعت میں افضل صحابی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ،فاروق اعظم حضرت عمر رضی اللہ عنہ،حضرت عثمان ذوالنورین ،علی

بن ابی طالب، ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم وغیرہ اجلہ صحابہ کا ایک بڑا طبقہ موجود تھا۔ لیکن سیرت کے مطالعہ سے ہمیں کوئی ایسی دلیل نہیں ملتی جس سے تبرک بآثار الصالحین کی مشروعیت کا استدلال کیا جا سکے حالاں کہ یہ صحابہ آپ کی ایک ایک سنت کو اپنانے والے اور ایک ایک امر کی پیروی کرنے والے تھے۔ امام ابن رجب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''۔۔۔ایسے ہی تبرک بالآثار کا معاملہ ہے، صحابہ نبی ﷺ سے تبرک حاصل کیا کرتے تھے، لیکن وہ ایک دوسرے سے تبرک نہیں حاصل کرتے تھے اور صحابہ کرام کے بلند مرتبہ کے باوجود تابعین ان سے تبرک نہیں حاصل کرتے تھے۔ تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ چیز صرف نبی ﷺ کے ساتھ کی جائے گی جیسے ان کے وضو کے فضلات، بال اور کھانے پینے کے بچے ہوئے حصے سے تبرک۔''

(الحکم الجدیرۃ لابن رجب: ۵۵)

اور اگر دوسرے ناحیے سے دیکھیں تو یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام نے اس کا سد باب کیا اور اس کی سختی کے ساتھ تردید بھی کی۔ حجر اسود جس کے تئیں لوگ بہت زیادہ عقیدت رکھتے ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''**إني أعلم أنک حجر لاتضر ولا تنفع ولولا أني رأیت رسول اللہ ﷺ یقبلک ماقبلتک**'' (النسائی 2937)

یعنی مجھے معلوم ہے کہ تو ایک پتھر ہے نہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ نفع، اگر میں نبی کریم ﷺ کو تجھے بوسہ لیتے ہوئے نہ دیکھتا تو میں تیرا بوسہ نہ لیتا۔

معرور بن سوید رحمہ اللہ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک سفر پر نکلے تو راستے میں ایک مسجد نظر آئی، لوگ اس میں نماز پڑھنے کے لیے دوڑ پڑے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ کیا معاملہ ہے؟ لوگوں نے کہا کہ اس مسجد میں آپ ﷺ نے نماز پڑھی تھی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تم سے پہلے کے لوگ اسی طرح کے کاموں کے سبب ہلاک ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اسے عبادت گاہ بنا لیا۔ سنو! اگر نماز کا وقت ہو جائے تو ایسی جگہوں پر پڑھ لیا کرو ورنہ اسے چھوڑ کر گذر جاؤ۔''

(کتاب البدع والنھی لابن وضاح: ۴۱۔۴۲)

شجرۃ الرضوان (جس کے نیچے بیعت رضوان واقع ہوئی تھی) لوگوں نے اس کے نیچے بھی تبرکا نماز پڑھنی شروع کر دی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو جب پتہ چلا تو آپ نے اس درخت ہی کو جڑ سے کٹوا دیا۔ (حوالہ سابق: ۴۲۔۴۳)

صحابہ کرام کے بعد سلف صالحین بھی اس سلسلے میں بہت احتیاط برتتے تھے اور تبرک کی اس نوع کو ناپسند کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص امام احمد رحمہ اللہ کے پاس آیا اور اپنا ہاتھ امام صاحب کے کپڑوں سے چھو کر اپنے منہ پر پھیر لیا۔ امام احمد رحمہ اللہ از حد ناراض ہوئے اور پوچھا کہ یہ تم نے کہاں سے سیکھا؟''

(الحکم الجدیرۃ بالاذاعۃ: ۵۶)

آثار صالحین سے تبرک کیوں ناجائز ہے؟

شریعت نے ہر اس دروازے کو بند کر دیا جس سے شرک کے داخل ہونے کا ذرا بھی خدشہ ہو اور یہ محض اس وجہ سے کہ عبادت کی تمام انواع صرف اللہ کے لیے ادا کی

جائیں۔آثار صالحین سے تبرک میں تو بظاہر کوئی قباحت نظر نہیں آتی مگر اس کی آڑ میں جو بدعات اور شرکیہ اعمال جنم لے سکتے ہیں اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔کتب تاریخ میں مذکور ہے کہ بنو اسماعیل جب تلاش معاش کے لیے مکہ سے نکلتے تو اپنے ہمراہ حرم کا کوئی پتھر رکھ لیتے ،جس سے مقصد محض تعظیم حرم ہوتی ،کہیں پڑاؤ کرتے تو یہ پتھر رکھ کر کعبہ کی طرح اس کا طواف کرتے۔رفتہ رفتہ یہ عادت اس کیفیت کو جا پہنچی کہ جو پتھر بھی انہیں پسند آیا اسی کو پوجنے لگے۔

(جائز اور ناجائز تبرک از ڈاکٹر علی بن نفیع العلیانی: ۵۳)

اس تناظر میں اگر موجودہ صورت حال پر نظر ڈالی جائے تو معاملہ اسی سے ملتا جلتا نظر آتا ہے۔آثار صالحین سے تبرک کے نام پر نت نئی بدعتیں ظاہر ہورہی ہیں۔ابتداء میں تو ان آثار سے تبرک حاصل کیا جاتا ہے اور یہاں تک بات پہونچتی ہے کہ انہیں برکت دینے والا خیال کیا جانے لگتا ہے حالاں کہ برکت عطا کرنا صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے جیسا کہ ہم نے پہلے بھی ذکر کیا۔امام شاطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''عام لوگ اس سلسلے میں ایک حد پر قائم نہیں رہتے بلکہ حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور برکت طلب کرنے میں جہالت کے سبب مبالغہ کر جاتے ہیں یہاں تک کہ متبرک بہ کی ایسی تعظیم کرتے ہیں جو حد سے باہر ہوتی ہے اور بسا اوقات متبرک بہ کے اندر ایسی چیز کا اعتقاد رکھتے ہیں جو اس کے اندر نہیں ہوتی۔'' (الاعتصام للشاطبی ۲/ ۹)

علما کے اقوال:

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''غار حرا، غار ثور، کوہ طور، نعل نبی پر بنی ہوئی عمارتیں یا مقام ولادت نبوی یا مقام بیعت عقبہ وغیرہ مقامات جو انبیاء وصالحین کی طرف کسی طرح منسوب ہیں، امت کے لیے کسی طرح جائز نہیں کہ ان کی زیارت کریں اور وہاں جا کر نماز وغیرہ کا قصد کریں اور اس میں کوئی خفا نہیں کہ اگر یہ عمل مشروع ومستحب یا کار ثواب ہوتا تو نبی ﷺ ضرور لوگوں کو اس کی خبر دیتے اور خود ان کا شوق کرتے۔تو جو شخص ان اعمال کو عبادت، طاعت اور تقرب گردانتا ہے وہ ان صالحین کے طریقہ پر نہیں ہے اور اس نے ایسا دین بنا دیا جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔''

(اقتضاء الصراط المستقیم لابن تیمیه)

شیخ سلیمان بن عبداللہ بن محمد بن وہاب نے آثار صالحین سے تبرک کے عدم جواز کی کئی وجوہات بیان کی ہیں ،ان میں سے ایک وجہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہم کسی شخص کے صالح ہونے کا تو گمان کر سکتے ہیں لیکن اس کے خاتمہ اعمال کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہی ہے۔تو ایسی صورت میں کسی شخص کے آثار سے تبرک نہیں حاصل کیا جاسکتا۔''

(تیسیر العزیز الحمید از شیخ سلیمان بن عبداللہ:۱۸۶)

شیخ ابن باز رحمہ اللہ نے آثار صالحین سے تبرک سے متعلق ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

''یہ (آثار صالحین سے تبرک) ایک منکر عمل ہے جو ناجائز ہے۔کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ مردوں یا ان کی قبروں سے تبرک حاصل کرے اور نہ ہی اللہ کے سوا کسی کو پکارے۔اس لیے کہ عبادت اکیلے اللہ کا حق ہے اور صرف

اسی سے برکت طلب کی جاسکتی ہے۔''

(مجموع فتاوی ومقالات متنوعہ لابن باز: ۴/ ۳۳۰)

ایک عبرت آموز واقعہ:

مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ جامع مسجد دہلی میں بیٹھے وعظ فرمارہے تھے کہ اتنے میں کچھ مجاورین تبرکات کے نام سے کچھ چیزیں جامع مسجد کے کمرے سے نکال کر باہر لائے تو لوگ احتراماً کھڑے ہوگئے لیکن مولانا بدستور بیٹھے رہے۔ مجاورین ان 'تبرکات' کو اکبر شاہ ثانی کے دربار میں لے جارہے تھے۔ وہاں پہنچ کر زاروقطار رونے لگے اور کہا ''حضور! ان تبرکات کی بڑی توہین ہوئی ہے۔ خاندان ولی اللہ کے ایک مولوی صاحب مسجد میں موجود تھے۔ جب ہم تبرکات لے جانے لگے تو لوگ ان کے احترام میں کھڑے ہوگئے مگر یہ مولوی صاحب بیٹھے ہی رہے۔'' بادشاہ نے شاہ صاحب کو طلب کیا اور کہا کہ نبی ﷺ کی زندگی پر کچھ روشنی ڈالیے۔ مولانا نے اہل مکہ کے مظالم اور سفر طائف وغیرہ کا اس انداز سے نقشہ کھینچا کہ بادشاہ زاروقطار رونے لگا۔ پھر بادشاہ نے استفسار کیا کہ مولانا! جب آپ نبی ﷺ کے فضائل ومحامد کے اتنے معتقد ہیں تو نبی کے تبرکات کی تعظیم کیوں نہیں کرتے؟ شاہ اسماعیل رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ اول تو ان تبرکات (نعلین اور موئے مبارک) کی آں حضرت سے نسبت پایہء ثبوت کو نہیں پہنچتی اور اگر یہ چیزیں تبرک کی ہوتیں تو آپ کو ان کی زیارت کے لیے جانا چاہیے تھا نہ کہ یہ چیزیں آپ اپنے پاس منگواتے۔ نیز مولانا نے صحیح بخاری منگوائی اور کہا کہ اس میں حضور ﷺ کی سنن پوری صحت کے ساتھ درج ہیں مگر آپ نے ان کی کوئی عزت نہیں کہ مگر یہ رسمی بال ونعل جن کی صحت پر کوئی شہادت نہیں آپ نے ان کی تعظیم کو ضروری سمجھا۔

(محبت رسول ﷺ از مقصود الحسن فیضی: ۱۱۵۔۱۱۷)

حرف آخر:

اس مفصل بحث سے ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ آثار صالحین سے تبرک ایک غیر شرعی عمل ہے جس کی کوئی اصل نہیں۔ روئے زمین پر انبیاء کے بعد سب سے افضل صحابہ کرام نے آثار صالحین (غیر نبی) سے نہ تو کبھی تبرک حاصل کیا اور نہ اس کی طرف رہنمائی کی، نہ اسے جائز سمجھا اور نہ اس پر عمل کیا۔ سلف صالحین اور ائمہ عظام نے بھی اس پر مطول ومدلل گفتگو کی ہے جس کا ماحصل یہی ہے کہ یہ ایک ناجائز عمل ہے جو سد ذریعہ کے طور پر ممنوع ہے۔

اللہ رب العزت ہمیں ہر قسم کے مبتدعانہ عمل سے بچائے اور دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے۔ آمین

■■

ابوالعلاء مَعَرِّی کا ایک شعر اور نظریہ ارتقاء

عبدالعلیم بن عبدالحفیظ سلفی
جمعیۃ الدعوۃ والارشاد مملکت سعودی عرب

و الذي حارت البرية فيه
حيوان مستحدث من جماد

(مخلوق جس کے بارے میں حیران ہے کہ ایک حیوان (ذی روح) جماد (غیر ذی روح) سے پیدا کیا گیا۔)

شعر کی بلاغی حیثیت:

یہ شعر ابو العلاء المعری (363ھ 449 -ھ) کے ایک لمبے قصیدہ کا جزء ہے، جسے ادباء نے فلسفۃ الحیاۃ والموت کا عنوان دیا ہے۔ معری کا یہ قصیدہ قصیدۃ دالیۃ کے نام سے مشہور ہے جسے اس نے اپنے منظوم سقط الزند میں ایک فقیہ کے مرثیہ میں کہی تھی۔

(دیکھئے: سقط الزند ص12-7/ط: دار بیروت ودار صادر)

اہل بلاغہ نے اس شعر کو عام طور سے مسند اور مسند الیہ کے قاعدے کے تحت ذکر کیا ہے، جسے مسند الیہ کا مسند پر مقدم ہونے کا مستدل بنایا ہے، جس کے تقدیم سے سامع کے ذہن میں خبر راسخ ہوجائے، نیز اس سے اس کے اندر خبر کا اشتیاق پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سی انوکھی چیز ہے جس کا ذکر متکلم کرنے والا ہے اور جس نے مخلوق کو حیرت زدہ کر رکھا ہے۔

(دیکھئے: لطائف التبيان في علمي المعاني والبيان لشرف الدين الطيبي 743ھ بتحقيق هنداوي/ص 65و كتاب عروس الأفراح في شرح تلخيص المفتاح للسبكي: 232/1)

شاعر اور اس کا عقیدہ ونظریہ:

ابوالعلاء المعری کا پورا نام أحمد بن عبداللہ۔ بن سلیمان القضاعی التنوخی المعری ہے، یہ عباسی دور کا شاعر، مفکر، فلسفی، نحوی اور ادیب تھا۔ اور اس دور کے اختلافی اور نزاعی افکار کا متحمل فلسفی کے طور پر جانا جاتا تھا۔ اس کی ولادت سنہ 363 ہجری میں معرۃ النعمان میں ہوئی تھی جو فی الوقت سوریا کے اندر محافظہ ادلب میں واقع ہے۔ بچپن میں ہی ایک بیماری (چیچک) کی وجہ سے نابینا ہوگیا تھا، صغرسنی سے ہی اس کے اندر شاعری کا ملکہ تھا، گیارہ بارہ سال کی عمر میں اس نے پہلی شاعری کی تھی۔ ابوزکریا تبریزی اس کی لغوی براعت وتفوق سے متعلق فرماتے ہیں: "ما أعرف أن العرب نطقت بكلمة ولم يعرفها المعري" میں کسی ایسے کلمہ سے متعلق نہیں جانتا جسے عرب نے بولا ہو اور معری اس سے واقف نہ ہو۔

(الفكر اللغوي عند أبي العلاء في ضوء علم اللغة الحديث للدكتور جمال محمد طلبة/ص 5)

اس نے اپنی زندگی ایک فلسفی اور دنیا سے بے رغبت انسان کی طرح گزاری۔ عصر حاضر کے معیار کے

مطابق (خاص طور سے خود ساختہ مغربی افکار کے تناظر میں) اسے حقوق الحیوانات کے دفاع کا بہت بڑا علم بردار مانا جاتا ہے۔ یہ متشدد سبزی خور تھا، گوشت خوری سے خود کو دور رکھتا تھا، اس کا ماننا تھا کہ کائنات میں کسی بھی جاندار کو تکلیف پہنچانا امر مکروہ اور غیر مناسب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ ہندستانی فکر وفلسفہ سے متاثر تھا۔ ابو العلاء معری کا عقیدہ ونظریہ علماء اسلام کے یہاں مشکوک رہا ہے، خاص طور سے دین کے معاملے میں اس کا نظریہ معروف ہے جس کے مطابق اس کا ماننا تھا کہ دین پہلے لوگوں کی ایجاد کردہ خرافات ہے:

أَفِيقُوا أَفِيقُوا يَاغُوَاةُ فَإِنَّمَا
دِيَانَاتُكُمْ مَكْرٌ مِنَ الْقُدَمَاءِ

(اے بھٹکے ہوئے لوگو! سدھر جاؤ تمہارے ادیان محض پہلے لوگوں کا فریب ہیں)۔

علامہ ابن کثیر، امام ابن قیم الجوزیۃ اور امام ابوالفرج بن الجوزی، وغیرہم نے اس کی طرف زندیقیت کی نسبت کی ہے۔ (البدایۃ والنہایۃ: 3/331، سیر أعلام النبلاء: 17/10، طبقات الشافعیۃ للسبکی: 5/288)۔

کچھ لوگوں نے اس کی نسبت قرامطہ کی طرف کی ہے۔ اس کے بعض اشعار میں ملتا ہے کہ اس نے قدماء کی رائے سے ہٹ کر بہت ساری باتیں کی ہیں، خواہ قدماء کی رائے سے ٹکراؤ ہی کیوں نہ پیدا ہو، جیسے:

وإني وإن كنتُ الأخيرَ زمانُه
لآتٍ بما لم تستطعه الأوائلُ

(اگرچہ میں بعد کے زمانے کا ہوں لیکن ایسی چیزیں بیان کرسکتا ہوں جس کی قدرت پہلے کے لوگوں کے اندر نہیں تھی)

اس کا ماننا تھا کہ حقد وکینہ، عداوت ودشمنی اور جنگ وجدال کے رواج میں ادیان وشرائع کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے:

إنَّ الشَرائِعَ أَلقَت بَينَنا إحناً
وَأَودَعَتنا أَفانينَ العَداواتِ

(شریعتوں نے ہمارے درمیان بغض ونفرت کو رواج دیا ہے، اور دشمنی کے فنون اور طریقوں سے واقف کرایا ہے)

دین اس کے یہاں رسولوں کے اختراع کے سوا کچھ نہیں ہے، جس کا مقصد لوگوں کو پریشان کرنا ہوتا تھا:

فلا تحسب مَقَال الرُسلِ حقّاً
ولكنْ قولُ زُورٍ سطّرُوهُ

(رسولوں کی بات کو سچ مت سمجھ، وہ تو ان کے لکھے ہوئے جھوٹ ہیں)

وكان النّاس في عَيْشٍ رَغِيدٍ
فجاءوا بالمُحَالِ فكدَّرُوه

(لوگ خوش وخرم عیش وعشرت کی زندگی گزار رہے تھے کہ ان لوگوں نے اپنی مہارت وچالبازی سے اسے مکدر کردیا)

اس کے علاوہ بھی اس کے عقائد ونظریات سے متعلق لوگوں نے بہت ساری باتیں لکھی ہیں۔ وہیں ایک دوسرا گروہ ہے جس نے اسے صحیح العقیدہ قرار دیا ہے ان میں ڈاکٹر طہ حسین، اور ڈاکٹر شوقی ضیف وغیرہ خاص ہیں۔ ڈاکٹر طہ حسین نے اس کی بڑی وکالت کی ہے اور اپنی مختلف کتابوں اور مضامین میں اس پر خوب لکھا ہے، جن میں سب سے مشہور کتاب "مع أبي العلاءِ في سجنِه" ہے۔ اسی طرح حافظ ابوطاہر السّلفی، امام ذہبی، مصری ادیب محمود محمّد شاکر ہندوستانی ادیب عبد العزیز میمني اور مصری قلم کار بنت

الشاطئ، وغیرہم نے اس کے صحیح العقیدہ ہونے کو بیان کیاہے۔کچھ دیگرادباءجیسے ابن الوردی وغیرہ نے لکھاہے کہ معرّی ابتداء میں زندیق تھالیکن آخرعمر میں صحیح اسلام کی طرف رجوع کرلیاتھا۔

(أبوالعلاءالمعرّي:دفاع المُؤرّخ ابن الندیم عنه/ ص 9-10و12-14)

امام ذہبی نے لکھاہے کہ یہ خودکوگھر میں مقید کرلینے یا پھرعدم بینائی کی وجہ سے رہین المحبسین کہا کرتا تھا۔وجہ یہ تھی کہ اس نے آخروقت میں اپنی وفات سنہ 449ھ تک معرۃ النعمان میں اپنے گھر کے اندرخودکوقید کرلیاتھا۔مرتے وقت اس نے وصیت کی تھی کہ اس کی قبرپر یہ عبارت کندہ کی جائے(هذاجَناهُ أبي عليَّ، وما جَنيتُ على أَحَد) جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا باپ اس کی ماں سے شادی کرکے اس کودنیامیں لانے کاسبب بنا، جوکہ ایک جرم،اولادکوناکردہ گناہ کی سزادینااوراس کے اوپرظلم ہے، کیونکہ اسےدنیامیں لاکرغم، مصیبت،حوادث، آفات اورتکالیف کےحوالےکردیا۔یہی وجہ ہے کہ اس نے شادی نہیں کی تھی،کیونکہ اس کاعقیدہ تھاکہ شادی اولادپرظلم ہےاوراس نےشادی نہ کرکے خودکوکسی پرظلم کرنے سےبچالیا۔اس کی قبرپراس زمانے کے بےشمار ادیبوں اورشعراءنے حاضری دی اوراس کے لئے اسی (80) مرثیہ کہے گئے۔ اس کی بےشمارتصنیفات ہیں جنہیں معجم الادباء کے اندرذکرکیاگیاہے،نیزابن خلکان نے وفیات کےاندربھی بہت ساری کتابوں کاذکرکیاہے، جیسے: الأیک والغصون، تاج الحرة،عبث الولید، رسالة الملائكة، شرح دیوان المتنبي، رسالة الغفران،خطبة الفصیح، الرسائل الإغریقیة، الرسالة المنبجیة،الفصول والغایات اللامع العزیزي، اللُزومیّات، سِقْطُ الزَنْد وغیرہ۔ان میں سے بعض مطبوع اوربعض مخطوط ہیں۔

شعرکامطلب اورمفہوم:

ساری مخلوق اس بات سے ششدراورحیران ہے کہ ایک عقل وفہم والامتحرک حیوان (یعنی انسان)جماد(جس کےاندرنہ عقل ہے،نہ سمجھ بوجھ ہےاور نہ ہی حرکت ہے) سے کیسے پیدا کیا گیاہے۔بعض اقوال کے مطابق اس سےآدم علیہ السلام کومرادلیاگیاہے،جنہیں مٹی جیسی جمادشیئ سے پیداکیاگیاتھا۔ ایک قول کےمطابق اس سے مقصود انسان ہے،ابن السید البطلیوسی(521 -444ھ)

شرح سقط الزند میں رقمطرازہے: "معناه:مقصود به الإنسان، والحیرة الواقعة فیه، من قبیل اتصال النفس بالجسم، إذ النفس جوهریة والجسم عرض؛ فلذلک یعدم الجسم الحیاة، إذا فارقته النفس، والحیرة الواقعة في نیاطهابه.

(عروس الأفراح في شرح تلخیص المفتاح:1/232 ط : المکتبة العصریة-بیروت–لبنان1423ھ).

اس سےمقصودانسان ہے،جس کےاندرروح اورجسم کےایک دوسرے سےاتصال پرحیرت واقع ہوتی ہے، کیونکہ روح جوہراورجسم عرض ہے(فلسفہ کی اصطلاح میں وہ شےجوقائم بالذات ہوجوہرہے۔اورجوکسی دوسرے کے ساتھ قائم ہوعرض کہلاتاہے.) یہی وجہ ہے کہ جب روح

جسم سے جدا ہوتی ہے تو جسم بے کار ہو جاتا ہے، حیرانگی درحقیقت روح کے جسم سے ارتباط سے ہوتی ہے۔ اس سے یہ مراد بھی لیا گیا ہے کہ آدمی بلکہ عام طور پر سارے حیوانات پانی (یعنی مادہ منویہ) سے معرض وجود میں آتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اس سے صالح علیہ السلام کی اونٹنی مراد لی ہے جو کہ قوم ثمود کے مطالبہ پر اللہ تعالی کے حکم سے بطور معجزہ ایک پہاڑ کے چٹان سے نکلی تھی۔ وہیں کچھ لوگوں نے موسی علیہ السلام کی عصا کو مراد لیا ہے، جس نے موسی علیہ السلام کو نبوت ملنے کے وقت اور فرعون کے جادوگروں سے مقابلہ کے وقت ازدہا کی شکل اختیار کر لیا تھا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ شاعر نے اس سے ققنس (فَقَنَّس) یا ققنوس Phoenix (جسے یونانی میں Phenix کہتے ہیں) نامی چڑیا مراد لیا ہے، یہ قصے کہانیوں کی ایک خیالی اور نہایت ہی خوبصورت چڑیا ہے، جس کا ذکر سندباد کے معروف انڈونچر والی کہانی اور الف لیلہ اور قدیم عربی کہانیوں میں ملتا ہے۔ اس کی آواز نہایت ہی جاذب اور شیریں ہوتی تھی۔ اس کا رنگ خوب سفید اور چونچ لمبی ہوتی تھی جس کے اندر چالیس سوراخ ہوتے تھے۔ اور بعض مصادر نے تین سو ساٹھ سوراخوں کا ذکر کیا ہے۔ ان سوراخوں سے نہایت ہی خوش گلو آوازیں نکلتی تھیں۔ بعض کہانیوں کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اسے ہندوستان میں پیدا کیا تھا، نیز بعض کہانی نگاروں نے ذکر کیا ہے کہ یہ چڑیا مختلف ناموں سے، عرب، چین، یونان، مصر اور ایران میں بھی پائی جاتی تھی، جیسے: عربی میں عنقاء کے نام سے چائنا میں فینگھوانگ (Fenghuang)، مصر میں طائر الفینیق (بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ مصریوں کے یہاں دوسرا پرندہ ہے)، اہل فارس کے نزدیک ھوما یا ھما اور سیمرغ یا قفنس یا قفنوس اور ترکیوں کے نزدیک قنرل (Qonrul) کے نام سے۔ اس پرندے کو بادشاہ گرسیماب صفت پرندہ بھی کہا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ ہما کا سایہ جس کے سر پر پڑ جائے وہ بادشاہ بن جاتا ہے۔ اور ہندی میں اسے अमरपक्षी یا मायापंछी (یعنی ہمیشہ زندہ رہنے والا یا جادوئی پرندہ) کہا جاتا ہے۔ یہ نہایت ہی رنگین سنہری یا بیگنی اور بعض روایتوں کے مطابق ہری یا نیلی رنگت کی ہوتی تھی۔ بعض قدیم افسانوں میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس کے اندر انسانی شکل اختیار کرنے کی صلاحیت تھی۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی قسم کی واحد چڑیا تھی جو پانچ یا چھ سو سال (بعض کہانیوں میں اس کی عمر چھ سو سال سے ہزار سال تک کا ذکر ہے) تک زندہ رہتی۔ پھر جب اللہ تعالی اس کی موت کا فیصلہ کرتا تو وہ پہاڑوں پر لکڑیاں جمع کرتی اور وہاں بیٹھ کر چالیس دنوں تک خود پر نوحہ کرتی، سارا عالم اکٹھا ہو کر اس کی آواز سے لطف اندوز ہوتا۔ پھر اس لکڑی پر بیٹھ کر اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتی جس سے اس لکڑی میں آگ لگ جاتی اور وہ لکڑی کے ساتھ جل کر راکھ بن جاتی، پھر بارش ہوتی اور اس راکھ (جماد) سے انڈے یا کیڑے پیدا ہوتے جس سے پھر اس چڑیا کا جنم ہوتا یا اس سے پھر دوسرا ققنس پیدا ہوتا۔ (اس پرندے کا ذکر ابن سینا نے بھی اپنی کتاب الشفا کے اندر کیا ہے)

(دیکھئے: تاج العروس:- 342 /16 مادۃ/ف ق ن س)

اس چڑیا کو رومن امپائر کے سلوگن اور قدیم یونانی فلسفہ کے اعتبار سے تناسخ ارواح نیز بعث بعدالموت کی علامت کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔(دیکھئے:عربی ویکیپیڈیا) اس کے علاوہ بھی لوگوں نے اس شعر کے دوسرے معانی بیان کئے ہیں جو نا قابل اعتناء اور شعر کی من مانی تاویلات ہیں۔

نظریہ ارتقاء اور ابوالعلاء کا یہ شعر:

بعض علماء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ قدیم یونانی فلاسفہ کا نظریہ ارتقاء (جس کا بہت بڑا داعی انگریز ماہر حیاتیات Charles Darwin چارلس ڈارون 1859ء تھا۔ اور اس کے اس ارتقائے حیات والے مفروضے کو ڈارونزم Darwinism سے موسوم کیا جاتا ہے۔) کہ حیاتی اجسام کے اندر بقا کے لیے ماحول کے مطابق تبدیلی ہوتی رہتی ہے، بلکہ خود کو یہ اجسام ماحول کے مطابق ڈھال لیتے ہیں، جسے انتخاب طبعی (Natural Selection) کا عمل کہا جاتا ہے۔ حالانکہ ڈارون کے نظریے کے اندر انسان کی بات نہیں کی گئی تھی مگر بہر حال اُس کا نظریہ بنی نوع انسان کے ساتھ ہر جاندار شے پہ لاگو ہوتا ہے۔ ڈارون کے نزدیک تمام جاندار اپنے اطراف کے ماحول میں زندہ رہنے کے لیے اپنی ہیئت کو تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ اسی نظریہ کے حاملین اس کے اندر امتداد پیدا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان بن مانس یا بندر کی نسل سے تھا جو اپنے ماحول کی وجہ سے تبدیل ہو کر موجودہ شکل وشباہت کا ہو گیا، جو کہ لاکھوں برس کے ارتقاء اور انتخاب طبعی Selection Natural کا ماحصل ہے۔ چمپینزی جیسے چوپائے سے دو پیروں پر انسان اس لیے کھڑا ہو گیا کہ اُس زمانے میں اور اُس وقت کے ماحول کے مطابق اُس کی بقاء کے لیے یہ ضروری تھا۔ ایک عام آدمی کی سماعت کو یہ نظریہ بڑا دلچسپ اور بھلا لگتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس پر سینکڑوں کہانیاں اور کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اور اسی سے متعدد فلمیں ، فیچرس اور افسانے جنم لے چکے ہیں۔ جبکہ ایک صحیح العقیدہ مسلمان کا ایمان اس کے قطعی برعکس ہے، جو ایک لاانکار حقیقت ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالی نے انسان کو بالکل اسی حلیے میں بنایا ہے جس میں وہ آج موجود ہے، جس کی صراحت خود باری تعالی نے کیا ہے:(لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ) (یقینا ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے) (سورۃ التین:4)۔ اسی طرح ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی متفق علیہ روایت اور اس معنی کی دیگر روایتوں میں وضاحت کی گئی ہے کہ اللہ تعالی نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے: خَلَقَ اللهُ آدَمَ عَلَى صُورَتِهِ۔۔۔ (صحیح البخاری 6227/، صحیح مسلم 2841/)۔ جیسا کہ سلف کے یہاں اس روایت کا معنی معروف ہے۔ اس موضوع پر گفتگو ایک لمبی بحث کی متقاضی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے قبل یہ نظریہ قدیم یونان میں موجود تھا۔ فتوحات اسلامیہ کے بعد یونانی کتب کا عربی میں ترجمہ کر کے اس تصور کو عرب میں عام کیا گیا، جسے بعض علماء عرب نے اختیار کیا، ان میں جاحظ، زکریا القزوینی، ابن خلدون، ابن مسکویہ اور اخوان الصفا کا نام خاص طور سے لیا جاتا ہے۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے:اردو انسائیکلوپیڈیا ارتقائیت کے زیر عنوان)

اورابوالعلاء معری نے اپنے شعر(والذي حارت البرية فيه.....حيوان مستحدث من جماد) کے ذریعہ اسی نظریہ کی صراحت کی ہے۔(دیکھئے: خاطرات جمال الدین الافغانی :6/155 ط :مکتبۃ الشروق الدولیہ 1423ھ)۔ حالانکہ بعض کے نزدیک ابوالعلاء کے اس شعر میں یہ نظریہ لائق اعتناء اس لئے نہیں ہے کہ اولا اس شعر کی حیثیت ایک پہیلی کی ہے،اوراس کے اندر کسی خاص نظریہ کی صراحت نہیں کی گئی ہے۔ابوالعلاء کے اس شعر کو ڈارون کے نظریہ ارتقاء پر منطبق کرنا اس لئے بھی صحیح نہیں ہے کہ اس کا مصداق- جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا- انسان کا مٹی سے یا ذی حیات کا پانی (منی) سے پیدا ہونا بھی ٹھہرتا ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ارتقائی نظریات کے حاملین کے لئے ابوالعلاء کے مذکورہ شعر کے علاوہ اس سے مشابہ کچھ اور اشعار بھی ہیں، جن سے ان کو دلیل فراہم ہوسکتی ہے ، جیسے : اس کا نظریہ ہے کہ حیوان کے اندر بقاء کی جدوجہد اور چاہت جبلی ہے، اس لئے جب اسے کسی ڈراونے اور خوفناک چیز سے واسطہ پڑتا ہے،تو فطرتا اس سے خوف کھانے لگتا ہے:

أَرى حَيوانَ الأَرضِ يَرهَبُ حَتفَهُ
وَيُفزِعُهُ رَعدٌ وَ يُطمِعُهُ بَرقُ

(میں روئے زمین کے جانور کو دیکھتا ہوں کہ وہ موت سے خوفزدہ رہتا ہے، بدلی کی کڑک اسے ڈراتی ہے اور بجلی کی چمک اس کے اندر امید اور لالچ پیدا کرتی ہے)۔

وہ مانتا ہے کہ جانوروں کو مضبوط اعضاء اور قوی ساخت و بناوٹ سے اس لئے مسلح کیا گیا ہے کہ ان کے اندر جدوجہد کا ملکہ پیدا ہو اور کامیابی وکامرانی کی چاہت کے ساتھ زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھ سکیں:

وَما جُعِلَت لِأُسودِ العَرين
أَظافيرُ إِلّا اِبتِغاءَ الظَفَر

(غاروں میں رہنے والے شیروں کے ناخن صرف اس لئے بنائے گئے ہیں کہ ان کے اندر کامیابی اور فتح وکامرانی کی چاہت ہو)

اور بقاء کی جنگ اور زندگی کی دوڑ میں ایک دوسرے سے تنازع اور تنافس سے متعلق کہتا ہے:

وَلا يُرى حَيوانٌ لا يَكونُ لَهُ
فَوقَ البَسيطَةِ أَعداءٌ وَحُسّادُ

(کوئی ایسا حیوان نظر نہیں آتا کہ روئے زمین پر اس کے دشمن اور اس سے حسد کرنے والے نہ ہوں۔)

ان کے علاوہ بھی مزید اشعار ہیں جنہیں طوالت کے خوف سے ذکر نہیں کیا جارہا ہے۔ بہرحال نظریہ ارتقاء ایک غیر شرعی، ملحدانہ اور غیر منطقی نظریہ ہے، ہر چیز کی تخلیق باری تعالیٰ کی طرف سے ویسے ہی کی گئی ہے جیسی ان کی موجودہ ہیئت وماہیت ہے،البتہ تہذیبی اور سائنسی ارتقاء نے بدلتے وقت کے ساتھ تعیش وتمدن کے طرز کو خاصا متاثر کیا ہے۔ خاص طور سے انسان سے متعلق اس نظریہ کے بطلان پر دلائل شرعیہ کے اندر وافر مقدار میں مواد موجود ہے، جس پر علماء امت نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اللہ رب العزت ہی صحیح راستے کی ہدایت دینے والا ہے۔

■■

بہائیت: عقائدوافکار

محمد ایوب سلفی

اسلام وہ مضبوط، عالمگیر وہمہ گیر اور روشن دین ہے کہ دشمنان اسلام اپنی ہر ممکن کوششوں اور ریشہ دوانیوں کے باوجود اس کی جامعیت اور ہمہ گیریت اور انسانی فلاح وبہبود پر مبنی تہذیب وثقافت کو مسخ کر دینے اور اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

یہ وہ دین ہے جو ہر دور میں مشرق ومغرب کے دشمنان اسلام کی جانب سے اٹھائے گئے چیلنجوں کے سامنے ناقابل تسخیر چٹان کی طرح ڈٹا رہا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہی وہ دین حق ہے جو اللہ رب العالمین کی طرف سے بندوں کے لیے اتارا گیا ہے اور اس کے اتباع اور پیروی کو پوری انسانیت کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے۔

اسلام کے خلاف ہر دور میں بے شمار تحریکیں برپا کی گئیں، ان تحریکوں میں ''بہائیت'' یا ''بابیت'' کی اسلام دشمنی کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس مضمون میں تحریک بہائیت کا سرسری جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

بہائیت کی حقیقت اور اس کا آغاز:

اس کافر وملحد فرقے کا وجود روسی اور عالمی یہودی انگریزی استعمار کے زیر سایہ اسلامی عقائد وتہذیب کو بگاڑنے اور امت مسلمہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے اور مسلمانوں کو ان کے سیاسی مسائل سے پھیر دینے کی غرض سے ایران میں ۱۲۶۰ھجری مطابق ۱۸۴۴ء میں عمل میں آیا۔

اس تحریک کا وجود یورپ کی اس دیرینہ خواہش کی تکمیل کے لیے راہ ہموار کرنے کے سلسلے کی ایک اہم کڑی کی حیثیت سے عمل میں آیا جو ابتداء ہی سے ان کے دلوں میں موجزن تھی اور وہ تھی اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب پر بند باندھنا اور دنیا سے اس کے اثر ونفوذ کو ختم کرنا۔

گلیڈ اسٹون (Glad Stone) نے کہا تھا:

''جب تک قرآن مسلمانوں کے ہاتھوں میں محفوظ رہے گا اس وقت تک یورپ کا غلبہ مشرق پر ممکن نہیں ہے اور نہ اہل یورپ چین وسکون کی سانس لے سکتے ہیں۔''

فرانس کے وزیر خارجہ ''ہانوٹو'' نے بھی اسلام کی آفاقیت اور ہمہ گیریت پر اپنی تشویش کا اظہار بایں الفاظ کیا تھا: ''سطح زمین پر کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں تک اسلام کا دائرہ وسیع نہ ہو گیا ہو اور اس کے ماننے والے وہاں تک نہ پہنچ گئے ہوں۔ یہ تنہا وہ دین ہے جس کی طرف لوگ بڑی تیزی کے ساتھ مائل ہو رہے ہیں اور وہ دیگر تمام ادیان ومذاہب پر تفوق وبرتری حاصل کرتا جا رہا ہے۔''

دراصل اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اہل یورپ کو ایک آنکھ نہیں بھائی۔ انہوں نے خفیہ اور اعلانیہ ہر طور پر مسلمانوں کو کمزور کرنے اور ان کو ان کے مصادر اصلیہ

قرآن وسنت سے دور کرنے کی کوششیں شروع کر دیں، ان کی انہیں کوششوں کے نتیجے میں عالمی ماسونیت کے ہاتھوں ایسے بہت سے فرقوں اور تحریکوں کا ظہور ہوا جو بظاہر تو اسلام کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے، مگر حقیقت میں وہ اسلام سے کوسوں دور تھے۔

بہائیت کی نشوونما اور اس کا بانی:

بہائیت کا اصل بانی ایران کے مشہور ومعروف شہر ''شیراز'' کا ایک باشندہ ''مرزا علی محمد'' ہے۔ وہ شیراز میں ۱۲۳۵ھ میں پیدا ہوا، اس کے بچپن میں ہی اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کی پرورش اور اس کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری اس کے چچا علی شیرازی نے لے لی تھی، علی شیرازی ایک تاجر آدمی تھا۔ اس نے اپنے بھتیجے کو تعلیم وتربیت کے ساتھ تجارت کے گُر بھی سکھائے، علی محمد کی طبیعت علم حاصل کرنے میں بالکل نہیں لگتی تھی جس کی وجہ سے اس کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا اور وہ مکمل طور سے اپنے چچا کی تجارت میں شریک ہو گیا۔

علم وادب سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا، بلکہ اس کے دل ودماغ پر ہمیشہ روحانیت اور ریاضیات کا بھوت سوار رہتا تھا۔ وہ اندھیری راتوں میں در بدر کی ٹھوکریں کھایا کرتا اور جیسے ہی سورج نکلتا ننگے بدن ہو کر پورے پورے دن سورج کے گولے کی طرف دیکھتا رہتا، پھر بہت ساری ہذیانی حرکتیں کرنے لگا۔ جب اس کے چچا نے اس کی یہ حرکتیں دیکھیں تو اس کے حالات کو بدلنے اور اس کی اصلاح کے لیے اسے کربلا بھیج دیا۔

علی محمد جس وقت کربلا پہنچا اس وقت کربلا باطنی تحریکوں کا گڑھ بنا ہوا تھا، وہاں باطنی فرقہ ''شیخیہ'' کے بانی احمد الاحسائی اور اس کے شاگرد کاظم رشتی کا بڑا چرچا تھا۔ مرزا علی محمد کربلا پہنچنے کے فوراً بعد کاظم رشتی کے حلقۂ درس میں شریک ہونے لگا۔ ایک دن وہ اچانک درس چھوڑ کر کوفہ کی ایک مسجد میں قیام پذیر ہو گیا اور چالیس دن کے بعد جب وہ مسجد سے نکل کر دوبارہ کربلا آیا تو اپنی عقل مکمل طور سے کھو چکا تھا، اسی کے بعد اس نے لوگوں کو اپنا سجدہ کرنے کی دعوت دی اور ساتھ ہی اس نے اپنا لقب ''باب'' رکھ لیا اور اس نے کہا کہ میں وہ دروازہ ہوں جس میں داخل ہو کر انسان فلاح وبہبود پا سکتا ہے۔ اسی لقب کی نسبت سے بہائیوں کو ''بابی'' بھی کہا جاتا ہے۔ مرزا علی محمد کی اس دعوت پر لبیک کہنے والا پہلا شخص ملا حسن مبشروئی تھا جس کو بابیوں نے باب الابواب کا لقب دیا تھا۔

مرزا علی محمد نے پہلے اپنے آپ کو مہدی منتظر کے لیے دروازہ کہا، پھر اس نے اپنے آپ کو مہدی کہا، پھر نبوت کا دعویٰ کر بیٹھا اور اس نے اپنے عقائدوافکار کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کیا جس کا نام ''البیان'' رکھا۔ اس کتاب میں اس نے صریح لفظوں میں یہ دعویٰ کیا کہ ''اللہ نے میری طرف یہ وحی کی ہے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع اور پیروی کرو۔'' (خفایا البھائیۃ، ص:۴۹)

اس نے یہ بھی کہا کہ میں محمد سے افضل ہوں اور میرا قرآن بھی محمد کے قرآن سے افضل ہے، اگر محمد نے قرآن کی سورت جیسی ایک بھی سورت لانے سے لوگوں کے عاجز رہ جانے کی بات کہی ہے تو میں بھی کہتا ہوں کہ انسان میرے قرآن کا ایک حرف بھی لانے سے عاجز اور درماندہ ہے۔ محمد

''الف'' کے مقام پر تھے اور میں ''نقطہ'' کا مقام رکھتا ہوں۔ (منقول از حقیقۃ البابیۃ والبھائیۃ بحوالہ مفتاح باب الابواب، ص:۲۰)

اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ذات الٰہیہ پر بھی دست درازیاں کیں اور اس نے کہا: ''میں قیوم الاسماء ہوں، میرے ظہور پر جو وقت گزرا سو گزرا، میں نے مصائب اور مشکلات پر صبر کیا ہے حتیٰ کہ میں نے سب کچھ حاصل کر لیا ہے اور اب کائنات میں میری ذات کے سوا کوئی چیز باقی نہیں۔ میں ایک آئینہ ہوں اور میری ذات میں اللہ کے سوا کچھ نہیں۔'' (مفتاح باب الابواب)

مستند حوالوں کے مطابق ''باب'' کو جب ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۹ء میں گولی مار دی گئی تو اس کے پیروکاروں نے اس کی نعش کو فلسطین لے جا کر ''کرمل'' نامی پہاڑ کے دامن میں دفن کر دیا اور اسی کے بعد سے کرمل پہاڑ بہائیوں کا قبلہ بن گیا۔

مرزا علی محمد کے قتل کے بعد مرزا حسین علی مازندرانی الملقب بہ بہاء اللہ اس کا خلیفہ ہوا۔ اس نے شیعیت اور صوفیت کے طرز کی تعلیم حاصل کی تھی اور اسے بدھسٹوں، برہمنوں، فلاسفہ اور ملحدین کی کتابوں پر کافی عبور حاصل تھا۔ اس نے اپنا لقب بہاء اللہ رکھا اور اسی وقت سے اس تحریک کا نام ''بہائیت'' پڑا۔ بہاء اللہ نے مندرجہ ذیل دعوے کیے:

۱۔ وہ باب کا خلیفہ اور اس کا جانشین ہے۔

۲۔ وہ مہدی منتظر ہے۔

۳۔ پھر اس نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔

۴۔ اس نے ''الاقدس'' نامی ایک کتاب لکھی جس کے ذریعہ واہیات اور خرافات پر مبنی اپنے عقائدوافکار کو خوب عام کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔

۵۔ پھر اس نے رب الارباب اور اللہ ہونے کا دعویٰ کیا اور اللہ کی بہت ساری صفات کمالیہ سے اپنے آپ کو متصف قرار دیا۔

بہائی عقائدوافکار:

■ بہائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ''باب'' پوری کائنات کا خالق ہے اور اسے اس اصل اور مبداء کی حیثیت حاصل ہے جس سے دنیا کی تمام چیزیں ظاہر ہوئی ہیں۔

■ بہائی وحدت الوجود اور اللہ کے ہر چیز میں حلول کرنے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

■ بہائی تناسخ ارواح (آواگون) کے قائل ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ روحوں کے لیے سزا و جزا کی بات محض خیالی ہے۔

■ یہ لوگ انیس (۱۹) کی عدد کو مقدس مانتے ہیں، مہینوں کی تعداد ان کے نزدیک ۱۹ ہے اور مہینے کے ایام بھی انیس ہیں۔

■ بہائی عقیدۂ ختم نبوت کے منکر ہیں اور محمد ﷺ کو آخری رسول نہیں مانتے۔

■ ان کے نزدیک دنیا کے تمام ادیان ومذاہب صحیح ہیں، تورات وانجیل محرف نہیں ہیں بلکہ اپنی اصلیت پر باقی ہیں ان کے نزدیک ان کا خود ساختہ مذہب بہائیت اسلام کا ناسخ ہے اور وہ تمام دنیا کے لوگوں کو بہائیت کا پیروکار دیکھنا

چاہتے ہیں۔

■ یہود ونصاریٰ کی طرح بہائی بھی عیسیٰ علیہ السلام کے سولی دیے جانے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

■ قرآن کی بیجا تاویل وتحریف کرکے اسے اپنے مذہب وعقیدہ کے موافق بنانا چاہتے ہیں۔

■ انبیاء ورسل کے معجزات، ملائکہ وجن اور جنت وجہنم ان کے نزدیک کوئی چیز نہیں ہیں۔

■ جہاد منسوخ ہو چکا ہے، جو جہاد بالسیف کا قائل ہے وہ ملعون ہے۔

■ عورتوں پر پردہ حرام ہے، متعہ حلال ہے، عورتوں کو سربازار بے پردہ نکلنا اور انہیں ہر محفل ومجلس میں کھلے عام شریک ہونا اور مال ودولت کے لیے ہر جائز وناجائز وسائل وذرائع کا استعمال عین مطلوب ہے۔

■ بہائی بڑی جرأت وبے باکی کے ساتھ جنسی بے راہ روی اور اباحیت کی دعوت دیتے ہیں اور ام سلمیٰ نامی ایک عورت جس کا لقب اس کے استاذ نے ''قرۃ العین'' رکھا تھا، اپنے شوہر سے علیحدہ ہوکر بہائی تحریک میں شامل ہو گئی اور ایران کی عورتوں کو جنسی بے راہ روی اور بے پردگی پر خوب ابھارا۔

■ بہائی قیامت کی تاویل بہاء اللہ کے ظہور سے کرتے ہیں نیز ان کا قبلہ کرمل پہاڑ ہے جہاں ''باب'' مدفون ہے۔

■ ان کے نزدیک بیک وقت دو بیویاں رکھنا ممنوع ہے۔

■ پانچوں وقت کی نمازیں منسوخ ہیں، دن ورات میں صرف نو رکعتیں مشروع ہیں اور ایک ماہ کے روزے بھی منسوخ ہیں، بہائیوں نے صرف انیس دن کے روزے مشروع کیے ہیں۔

بہائیت چند مذاہب کا معجون مرکب:

بہائیت دراصل فرق ضالہ بالخصوص اسماعیلیہ وشیخیہ، یہودیت ونصرانیت، دہریت، شیعیت، بدھسٹ، ہندوازم اور زرتشتی جیسے مشرکانہ اور کافرانہ مذاہب وعقائد اور فلسفیانہ آراء وافکار کا مجموعہ ہے۔ ''مفتاح باب الابواب'' کے مصنف بابیوں اور بہائیوں کی صفت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''بابیوں اور بہائیوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کے لیے ایک خاص دین ہے جو بدھ مذہب، برہمنیت، بت پرستی، آتش پرستی، یہودیت ومسیحیت، اسلام اور دیگر صوفیانہ، فلسفیانہ اور باطنی عقائدوافکار کا معجون مرکب ہے۔''

(منقول از المذاھب المعاصرۃ وموقف الاسلام منھا، ص: ۲۶۲، از دکتور عبدالرحمن عمیرۃ)

■■

اساتذہ وطلبہ کے درمیان باہمی رشتے

مجاہدالاسلام
متعلم: کلیۃ الدعوۃ/۲

اساتذہ (Teachers) کسی بھی قوم کی تعمیر وترقّی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اساتذہ کا شمار قوم کے باشعور طبقے میں ہوتا ہے۔ اساتذہ کے فرائضِ مَنْصَبِی میں تعمیرِ قوم، کردار سازی، تزکیۂ نفس، قیادت کی تیاری، طلبہ کو اعلیٰ نظریات سے مُتَّصِف کرنا، حق و باطل، جائز و ناجائز اور حلال وحرام کا شعور بیدار کرنا بھی شامل ہیں۔ انہیں اہم ذمہ داریوں کی ادائیگی کی وجہ سے اُستاد کو روحانی باپ کا درجہ دیا گیا۔

کہتے ہیں کہ استاد دراصل قوم کے مُحافِظ ہیں کیونکہ آئندہ نسلوں کو سنوارنا اور ان کو ملک کی خدمت کے قابل بنانا انہیں کے سپرد ہے۔ سب محنتوں سے اعلیٰ درجے کی محنت اور کارگزاریوں میں سب سے زیادہ بیش قیمت کارگزاری ملک کے اساتذہ کی ہے۔ استاد ومعلم کا فرض تمام فرائض سے زیادہ مشکل اور اہم ہے کیونکہ تمام قسم کی اخلاقی، تمدنی اور اُخروی نیکیوں کی چابی اسی کے ہاتھ میں ہے اور ہمہ قسم کی ترقی کا سرچشمہ اس کی محنت ہے۔

استاد کی شان:

استاد اور معلم ہونا بہت عزت وشرف کی بات ہے، اللہ پاک کے آخری نبی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان عالیشان ہے: **خیرُکم من تعلَّمَ القرآنَ وعلَّمَه** (صحیح بخاری، 5027) تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔

نسل انسانی کی بہترین پرورش کی ذمہ داری بنیادی طور پر دو لوگوں پر ڈالی گئی ہے (۱) والدین اور (۲) اساتذہ پر۔

استاد اور شاگرد کا رشتہ معنی ومفہوم کے اعتبار سے انسانی زندگی کا ستون ہے۔ وہ ستون جو زندگی کو معنی اور مفہوم کے حسین رنگوں سے نکھار دیتا ہے۔ ایک بہترین استاد طالب علم کو اچھے اخلاق وکردار کی بلندیوں تک لے جاتا ہے۔ وہ شاگرد کو اعلیٰ اخلاق وکردار، آداب عالیہ اور عمدہ تہذیب وثقافت سے آراستہ کرتا ہے۔

استاد کی عظمت کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے دنیا بھر میں ۵/اکتوبر کو ٹیچرز ڈے منایا جاتا ہے۔ ہمارے دین میں بھی استاد کے مقام کو خاص حیثیت حاصل ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ جس نے مجھے ایک لفظ سکھایا اس نے مجھے اپنا غلام بنالیا۔

استاد کی ضرورت:

ایک انسان استاد کے بغیر کبھی بھی کامیاب شخصیت کا حامل نہیں ہوسکتا۔ ہر کامیاب انسان کے پیچھے ہنرمند استاتذہ کا ہاتھ پایا جاتا ہے جو اس کی شخصیت کو نکھار کر دنیا کے سامنے لاتے ہیں۔ استاد کا مقام یہ ہے کہ وہ معاشرے کو

ڈاکٹرز، انجینیئر ، سائنسدان مہیا کرتے ہیں۔ یہ وہ فیکٹری ہے کہ جہاں سے خام مال سونا بن کر نکلتا ہے اسی لیے اس کی عزت کرنا شاگردوں پر لازم ہے۔

خلیفہ ہارون رشید کے دوصاحبزادے امام کسائی رحمہ اللہ کے پاس زیرِ تعلیم تھے۔ایک بار استاد کے جانے کا وقت آیا تو دونوں شاگرد انہیں جوتے پیش کرنے کے لیے دوڑے، دونوں ہی استاد کے آگے جوتے پیش کرنا چاہتے تھے، یوں دونوں بھائیوں میں کافی دیر تک تکرار جاری رہی اور بالآخر دونوں نے ایک ایک جوتا استاد کے آگے پیش کیا۔ خلیفہ ہارون رشید کو اِس واقعے کی خبر پہنچی تو بصد احترام امام کسائی کو دربار میں بلایا۔

مامون رشید نے امام کسائی سے سوال پوچھا کہ، استادِ محترم، آپ کے خیال میں فی الوقت سب سے زیادہ عزت واحترام کے لائق کون ہے؟ مامون رشید کے سوال پر امام کسائی قدرے چونکے۔ پھر محتاط انداز میں جواب دیا، میں سمجھتا ہوں کہ سب سے زیادہ احترام کے لائق خلیفہ وقت ہیں۔خلیفہ ہارون کے چہرے پر ایک گہری مسکراہٹ اتری اور کہا کہ، ہرگز نہیں استادِ محترم، سب سے زیادہ عزت کے لائق وہ استاد ہے جس کے جوتے اٹھانے کے لیے خلیفہ وقت کے بیٹے آپس میں جھگڑیں۔

استاد کی حیثیت دورِ حاضر میں:

پرانے زمانے میں جب انسان مشینی دور سے آزاد تھا اور بڑے چھوٹے کی تمیز خوب سمجھتا تھا' تب استاد کو شاگرد کے والدین جیسی حیثیت اور رتبہ حاصل ہوا کرتا تھا مگر جیسے جیسے وقت نے اپنے پہیئے دوڑائے' رشتوں سے احترام ختم ہونے لگا اور یہ دراڑ سب سے زیادہ استاد اور شاگردوں کے رشتے پر نمایاں ہُوئی ۔ دونوں تدریس کو پیشہ سمجھنے لگے۔ اب حال یہ ہے کہ ٹیچرز کو ایک معمولی سرونٹ کی حیثیت حاصل ہے خاص کر پرائیویٹ سکول ٹیچرز کو، حالانکہ پہلی جماعت سے لیکر دسویں جماعت تک کے استاتذہ ہی بچے کی شخصی تربیت کرتے ہیں۔ان کی بنیاد بناتے ہیں۔انہی بنیادوں پر چل کر یہ آگے زندگی میں کامیابی کی منازل طے کرتے ہیں۔

مگر افسوس کہ آج ایک پرائیوٹ سکول ٹیچر کا کوئی پرسان حال نہیں جبکہ استاد اور شاگرد کے درمیان بھی وہ رشتہ نظر نہیں آتا جو بیسویں صدی تک دکھائی دیتا تھا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے نونہالوں کی بہترین شخصیت بنانے والے معماروں کی قدر کی جائے۔ والدین نونہالوں کو استاد کی اہمیت اور عزت وتکریم سے آگاہ کریں کیونکہ ایک استاد ہی بچے کا پہلا رول ماڈل ہے۔اس رشتے کو مزید مضبوط بنانے کے لئے استاد اور شاگرد دونوں کو اہم کردار نبھانے کی ضرورت ہے۔

مختصراً کہیں تو وقت کے دھارے کے ساتھ زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح تعلیم جیسا مقدس پیشہ بھی اخلاقی پستی کا شکار ہوا ہے، معلم اور متعلم دونوں ہی کے لیے اب صرف اپنی ذات ہی سب سے زیادہ عزیز ہے اور استاد اور شاگرد کے درمیان صدیوں پرانا جو بے لوث اور پُرخلوص رشتہ دیکھنے کو ملتا تھا، اب وہ کافی حد تک ماند پڑ چکا ہے۔

طالب علم کیسا ہو:

☆ طالبِ علم کو چاہئے کہ استاد کی ہر بات توجہ سے

سنے اور اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرے، ممکن ہو تو لکھ بھی لے، اگر استاد صاحب کی آواز صحیح طور پر آپ تک نہیں پہنچ رہی تو ادب وتعظیم کے ساتھ مناسب انداز میں ان سے عرض کردیں۔

☆ اس بات کا انتظار نہ کرے کہ استاد صاحب سبق سُنانے کا فرمائیں گے تو سناؤں گا بلکہ خود ہاتھ اٹھا کر سبق سنانے کی کوشش کرے۔

یہ بھی یاد رکھئے! کہ ہر کوئی ہر فن کے حوالے سے ہدایت ورہنمائی نہیں کرسکتا، اس لئے ہر فن اور علم کے مطالعہ کے حوالے سے اس علم کے ماہر (Expert) استاد صاحب سے مشورہ کیجئے اور کچھ نہ کچھ غیر نصابی کتابوں کا مطالعہ لازمی کرنا چاہئے۔

مثالی استاد:

ایک بہترین اور معاشرے کے خیرخواہ استاد کے اوصاف کو چار عنوانات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: (۱) استاد کا کردار وگفتار (۲) اسباق کی تیّاری اور پڑھانے کا انداز (۳) طلبہ کے ساتھ تعلّقات (۴) طلبہ کی صلاحیتوں اور میلانِ طبعی کی پَرَکھ (پہچان)۔

۱۔ استاد کا کردار وگفتار:

☆ کامیاب ترین استاد وہ ہے جو اپنے علم پر پہلے خود عمل کرے تبھی طلبہ اس کی باتوں پر عمل کریں گے، کسی دانا کا قول ہے کہ عالِم جب اپنے علم پر عمل نہیں کرتا تو اس کی نصیحتیں دلوں سے اس طرح پھسل جاتی ہیں جس طرح سخت چٹان سے بارش کے قطرے پھسل جاتے ہیں۔

☆ استاد کو حسن اخلاق کا پیکر ہونا چاہئے تاکہ ذہین و غیر ذہین تمام طلبہ اس سے استفادہ کرسکیں، اکثر دیکھا گیا ہے کہ سخت رویے والے اساتذہ کے غیر ذہین شاگرد ناکامی ہی کی طرف گرتے جاتے ہیں جس کی بڑی وجہ استاد کے سامنے اپنا مافی الضّمیر (یعنی دلی بات) نہ کہہ سکنا اور سوال کرنے سے ڈرتے رہنا بھی ہوتی ہے۔

☆ وقت کی پابندی کا سب سے بڑا عملی نمونہ ایک استاد کو ہی ہونا چاہئے، کیونکہ جس قدر وہ پابند وقت ہوگا، اس کے شاگرد بھی وقت کی پابندی کریں گے، پھر یہی پابند وقت طلبۂ علم عملی زندگی میں بھی وقت کے قدردان ثابت ہوں گے۔

☆ انسانی زندگی میں نشیب وفراز (اُتار چڑھاؤ) آتے رہتے ہیں، پریشانی، بیماری اور ضروریاتِ زندگی کے معاملات ہر کسی کے ساتھ ہوتے ہیں، لیکن طبیعت کی ہلکی پھلکی ناسازی اور ایسے کام جو کوئی دوسرا بھی کرسکتا ہے ان کی وجہ سے چُھٹّی کرلینا یا درسگاہ دیر سے پہنچنا مُناسب نہیں، ایک اچھے استاد کے پیشِ نظر قوم کا مستقبل ہوتا ہے جو ایک چھٹی کیا ذرا سی تاخیر سے بھی متاثر ہوتا ہے۔

۲۔ اسباق کی تیّاری اور پڑھانے کا انداز:

☆ جس فن اور علم میں مہارت ہو وہی استاد پڑھائے، خود سیکھنے کے لئے بچوں پر تجربہ نہ کرے بلکہ پہلے خود اچھی طرح پڑھے، سیکھے، سمجھے پھر بچوں کو پڑھائے۔

☆ بے شک معلم کا رُتبہ بہت عظیم ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر معلم ہر پہلو سے کامل واکمل ہو، سیکھنے سکھانے کا عمل ساری زندگی جاری رہتا ہے اس لئے ایک استاد کو چاہئے کہ اپنی کمی اور کوتاہی کو اعلیٰ ظرفی سے تسلیم کرے اور

ان پر قابو پانے کی کوشش کرے۔

☆ اساتذہ کی اوّلین کوشش اپنے شاگردوں کی کامیابی ہونی چاہئے اور اس کے لیے اساتذہ کو بچوں کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں بہت محنت کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ بچوں کی تعلیمی بنیادیں ہیں۔

☆ استاد کا فرض بنتا ہے کہ جو بھی سبق پڑھانا ہے اولاً اچھی طرح سے اس کا مطالعہ کرے، سمجھے اور سمجھانے کے لئے تیاری کرے، جس قدر ہو سکے آسان انداز میں سمجھائے، سبق کو آسان بنانے کے لئے مثالیں بیان کرے اور طلبہ کی ذہنی سطح کا لازماً خیال رکھے۔

☆ ہر شعبۂ زندگی میں قابل افراد مہیا کرنے کے لئے تعلیم وتربیت بہت ضروری ہے اور تعلیم وتربیت کی اہم ذمّہ داری معلم ومدرس پر عائد ہوتی ہے۔ یوں تو ہر فن اور مضمون کے استاد کو اپنے مضمون کے اعتبار سے محنت کرنی اور کروانی ضروری ہے لیکن اسکول کالج میں اسلامیات اور اس سے متعلقہ مضامین کے اساتذہ کی ذمہ داری بقیہ دیگر مضامین کے اساتذہ سے زیادہ اہم ہے۔ اسلامیات کے استاد کو یاد رکھنا چاہئے کہ وہ دین اور مذہب کی تعلیم دے رہا ہے، اس لئے اوّلاً خود اس مضمون اور سبق کو اچھی طرح سمجھتا ہو، قرآن وحدیث میں اپنی ذاتی رائے ہرگز نہ دے، بزرگوں اور اَسلاف نے جو لکھا اور بیان کیا وہی طلبہ کو سکھائے۔ ایمانیات کی بنیادی باتیں، عقائد اور فرض علوم جو نصاب میں شامل ہوں لازماً اور اچھے انداز میں سکھائے اور ان کے دل میں ایمان کو ایسے بٹھادے کہ وہ دنیا کے کسی بھی ادارے یا شعبے میں جائیں تو پکے سچے صحیح العقیدہ مسلمان رہیں۔

۳۔ اس کا رویہ طلبہ کے ساتھ اچھا ہو طلبہ کوئی سوال کریں تو اس کا جواب اچھی طرح دے۔

۴۔ استاد کی نظر ہر طالب علم پر ہو، ہر ایک کو اچھا سمجھے، ہر ایک کے لیے کامیابی کی امید اور تمنا کرے۔

اللہ تعالیٰ ہم تمام طلبہ کو صحیح سمجھ دے کہ ہم تمام اپنے اساتذہ کی قدر کریں اور ان سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کی کوشش کریں۔

آمین یارب العالمین

■■

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت والے دن قرآن کو اور ان لوگوں کو جو دنیا میں اس پر عمل کرتے تھے (بارگاہ الٰہی میں) پیش کیا جائے گا۔ سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران ان کے آگے ہوں گے۔ اپنے پڑھنے والوں کی طرف سے جھگڑا کریں گے۔

(صحیح مسلم)

ماہ ربیع الاول اور ہماری ذمہ داریاں

سمیہ خاتون محمد ایوب سلفی
طالبہ فضیلت سال آخر جامعہ رحمانیہ مدنپورہ، بنارس

ربیع الاول کا مہینہ سایہ فگن ہے، یہ مہینہ اسلامی سال کا تیسرا مہینہ ہے، یہی وہ مہینہ ہے جس کے دامن میں سرور کونین ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی اور اسی مہینے میں آپ ﷺ دار فانی سے دارالبقا کی طرف رحلت فرما گئے۔ جس طرح سے یہ مہینہ خوشی ومسرت کا مہینہ ہے اسی طرح سے ہمارے لیے حزن وملال کا بھی مہینہ ہے۔ اس مہینے میں کسی مخصوص نیک عمل کی فضیلت کتاب وسنت میں وارد نہیں ہوئی ہے لہٰذا جو مسنون اعمال عام دنوں میں کیے جاتے ہیں وہ سارے اعمال اس مہینے میں بھی مداومت کے ساتھ کیے جائیں گے۔

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو آپ نے دین کو ناقص نہیں چھوڑا بلکہ آپ ﷺ کو اللہ کی طرف سے جو پیغام ملا تھا آپ نے اسے مکمل لوگوں تک پہنچا دیا اور اس پیغام کو لوگوں تک پہنچانا آپ کا فرض تھا کیونکہ اللہ کی طرف سے آپ کو حکم ملا تھا۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ (المائدہ: ٦٧) اے اللہ کے رسول جو آپ پر آپ کے رب کی جانب سے نازل ہوا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دیجیے اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے رسالت کا حق ادا نہیں کیا۔

ہمیں کامل یقین ہے کہ نبی ﷺ نے پیغام الٰہی لوگوں تک پہنچا کر رسالت کا حق ادا کر دیا ہے۔ گویا آپ نے دین اسلام میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ اب اگر ہم دین سے کوئی چیز نکالتے ہیں تو اس میں نقص پیدا کرنے کا جرم ہم پر عائد ہوگا اور اگر اس میں مزید کوئی چیز داخل کرتے ہیں تو اپنے اس عمل سے اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے رسالت کا حق ادا نہیں کیا۔ اس لیے امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا تھا: ''من ابتدع في الإسلام بدعة يراه حسنة فقد زعم أن محمدا خان الرسالة، لأن الله يقول: الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الإِسْلاَمَ دِيناً '' (المائدۃ:۳) (الاعتصام للامام الشاطبی: ۱/ ۵۴) جس نے دین میں کوئی نیا کام ایجاد کیا اور اسے اچھا سمجھا تو اس نے یہ گمان کیا کہ محمد ﷺ نے رسالت میں خیانت کی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرما دیا ہے کہ میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو مکمل کر کے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند فرما لیا ہے۔

معلوم یہ ہوا کہ جتنا دین ہمیں نبی ﷺ دے کر گئے ہیں صرف اتنے پر ہی عمل کرنے سے انسان جنت کا حقدار بن سکتا ہے۔ محبت رسول کا بھی کوئی اگر اظہار کرنا چاہتا ہے تو

اسے بھی خالص دین اسلام پر عمل کرنا ہوگا۔ نبی ﷺ سے محبت کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا محبت کا مطلب یہ ہے کہ ہم سال میں صرف ایک روز آپ ﷺ کی ولادت کا جشن منالیں؟ یا آپ سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم آپ کے لائے ہوئے دین اسلام کو اپنی زندگی میں بھی نافذ کریں اور گردوپیش کے ماحول کو بھی اسی کے مطابق بنانے کی حتی المقدور کوشش کریں۔ اگر اول الذکر بات ہے تو ظاہر ہے کہ اس خودساختہ معیار محبت کی رو سے صحابہ کرام، تابعین عظام اور ائمہ دین بھی نبی کریم ﷺ کی محبت سے بے گانہ قرار پائیں گے کیونکہ جشن میلاد کا یہ اہتمام صحابہ کرام، تابعین عظام اور ائمہ دین میں سے کسی نے بھی نہیں کیا اور نہ ہی کسی نے اس کا حکم دیا اور اگر محبت کا مفہوم وہ ہے جو صحابہ کرام نے سمجھا، تابعین اور تبع تابعین نے سمجھا اور امامان دین نے سمجھا کہ آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کو اپنایا جائے، اپنے کردار کو دین کے ڈھانچے میں ڈھالا جائے اور دینی اقدار وروایات کو فروغ دیا جائے جیسا کہ صحابہ وتابعین اور ائمہ دین نے کیا تو پھر سوچنے والی بات یہ ہے کہ کیا ہمارا یہ ''جشن میلاد'' ان کے اعمال سے کسی قسم کی کوئی مناسبت رکھتا ہے؟

اور یہ بھی واضح ہے کہ نبی ﷺ کے فرمان کی رو سے دین میں اپنی طرف سے اضافہ مردود اور ناقابل قبول ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد'' (صحیح بخاری: ۲۶۹۷) دین میں اضافہ شدہ کام (بدعت) مردود ہے۔

اور یہ گمراہی بھی ہے جو جہنم میں لے جانے والی ہے۔ كل بدعة ضلالة وكل ضلالة في النار (صحیح الجامع الصغیر: ۱۳۵۳) مگر افسوس کہ اس مہینے میں بارہ تاریخ کو بڑی دھوم دھام سے نبی کریم ﷺ کا یوم ولادت منایا جاتا ہے، جگہ جگہ جلوس نکالے جاتے ہیں، گلی گلی چراغاں کیا جاتا ہے، مختلف مقامات پر جھنڈیاں لگائی جاتی ہیں، آتش بازی اور رقص وسرود کی مخلوط اور غیر مخلوط محفلیں سجائی جاتی ہیں، کھانے پکانے کا بھی خوب اہتمام ہوتا ہے اور اس بدعت کو تیسری عید قرار دیا جاتا ہے حالانکہ اسلام میں صرف دو ہی عیدیں مقرر کی گئی ہیں جس میں صرف نماز اور تکبیر وتہلیل کا حکم ہے لیکن اس نام نہاد تیسری عید میں نماز اور تکبیر وتہلیل کے علاوہ سب کچھ کیا جاتا ہے حالانکہ یہ سارا انداز غیر اسلامی ہے جس کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ کفار کی نقالی اور ان کی مشابہت ہے حالانکہ ہمیں کفار کی مشابہت سے منع کیا گیا ہے۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے: ''من تشبه بقوم فهو منهم'' (سنن ابی داود، کتاب اللباس: ۴۰۳۱) جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے گا وہ انہی میں سے سمجھا جائے گا۔

بہرحال چاہے جس اعتبار سے دیکھا جائے جشن عید میلاد النبی کی کوئی شرعی ودینی حیثیت سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ محبت رسول کے نام پر ایسا کھوکھلا مظاہرۂ عقیدت ہے جس کی تائید نہ قرآن سے ہوتی ہے اور نہ حدیث سے، نہ صحابہ وتابعین کے کردار سے اور نہ ائمہ دین کے اقوال وافعال سے لہٰذا ہم تمام مسلمانوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ ہم محبت رسول ﷺ کے تقاضے کو سمجھیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

اخبار جامعہ

مولانا ابوصالح دل محمد سلفی

''برنامج اتقان'' کے پروگرام کا انعقاد:

جامعہ سلفیہ بنارس میں طلبہ کے اندر علمی مسابقہ کا ذوق پیدا کرنے اور ان کی تحریری وتقریری خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کے لیے ''برنامج إتقان لتنمية المهارات العلمية والثقافية'' کے نام سے ایک مستقل شعبہ زیر اشراف ''ندوۃ الطلبہ'' قائم ہے، جس کے تحت پندرہ دن پر اساتذۂ کرام حفظہم اللہ کی صدارت واشراف میں دینی وعلمی، ادبی وثقافتی اور فکری وتحقیقی پروگرام کا انعقاد عمل میں آتا ہے اور طلبہ محاضرہ وعلمی مذاکرہ، مناظرہ ومباحثہ، ڈرامہ ومکالمہ، برجستہ تقریر وسوال وجواب اور بیت بازی کی شکل میں علمی مظاہرے کرتے ہیں اور طلبہ کی تشجیع وحوصلہ افزائی کی غرض سے اس پروگرام میں حصہ لینے والے طلبہ کو انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ رواں تعلیمی سال (۲۰۲۲۔۲۰۲۳ء) میں اب تک برنامج اتقان کے تین پروگرام ہو چکے ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

■ پہلا پروگرام بتاریخ ۲۳/ جون ۲۰۲۲ء بروز جمعرات بوقت بعد نماز عشاء بمقام قاعۃ المحاضرات بعنوان: ''اسلام اور مسلمانوں کے متعلق شکوک وشبہات اور ان کا ازالہ'' زیر صدارت فضیلۃ الشیخ خورشید عالم مدنی حفظہ اللہ منعقد ہوا۔ پروگرام کا آغاز سراج الدین محمد فاروق (کلیۃ الدعوۃ/ثالث) کی تلاوت قرآن سے ہوا۔ پھر ثمامہ ثاقب عبدالمنان (عالم اول) نے نعت نبی پیش کی۔ اس کے بعد عبدالرب انیس الرحمن (عالم اول) نے ''اورنگ زیب عالمگیر کی مذہبی رواداری'' کے عنوان پر اور محمد اسماعیل محمد ابراہیم (کلیۃ الحدیث/ثالث) نے ''نبی ﷺ سے متعلق شکوک وشبہات اور ان کا ازالہ'' کے عنوان پر تقریر کی۔ پھر علقمہ طارق عبدالمنان (عالم سال اول) نے حالات حاضرہ پر ایک نظم پڑھی۔ بعد ازاں برجستہ سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہر مرحلہ (ثانویہ، عالمیت، کلیات) کے لیے الگ الگ سوالات کیے گئے جن میں سے اکثر کے جواب طلبہ نے دیے۔

اخیر میں صدر پروگرام مولانا خورشید عالم مدنی حفظہ اللہ نے صدارتی خطاب پیش کیا۔ آپ نے اپنے خطاب میں طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ کو اپنے وغیر سبھوں تک پہنچانا وقت کی اہم ضرورت ہے تاکہ اس تعلق سے کسی کو کوئی اعتراض کرنے کا موقع نہ ملے اور ہر کوئی سیرت نبوی سے رہنمائی حاصل کرے۔

■ دوسرا پروگرام ۱۱/ اگست ۲۰۲۲ء بروز جمعرات بعد نماز عشاء بمقام قاعۃ المحاضرات بعنوان: ''ماہ محرم اسلام کی نظر میں اور سانحۂ کربلا تاریخی حقائق کے آئینے میں'' زیر صدارت فضیلۃ الشیخ عبداللہ زبیر سلفی حفظہ اللہ منعقد ہوا، جس کا آغاز مصدق علی عتیق الاسلام (عالم ثانی) کی تلاوت قرآن

سے ہوا، پھر خورشید عالم شمس الدین (عالم اول) نے نعت نبی پڑھی۔اس کے بعد مجاہد الاسلام منصور عالم (کلیۃ الدعوۃ/ثانی) نے ''ماہ محرم اور اس کی رسومات'' کے عنوان پر اردو زبان میں تقریر اور اسامہ امین امین اللہ (عالم ثانی) نے ''سانحۂ کربلا ایک تحقیقی جائزہ'' کے عنوان پر مقالہ پیش کیا۔ پھر سہیل اختر محمد منظور عالم (عالم اول) نے بہترین آواز و انداز میں ایک نظم پڑھی۔اس کے بعد ''رسومات محرم اور واقعۂ کربلا'' کے متعلق برجستہ سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔

درج ذیل طلبہ نے برجستہ جواب دینے کا شرف حاصل کیا۔

محمد عارف محمد سلیم (کلیۃ الشریعۃ/ثالث)
عبداللہ سہل (عالم اول)
گلشاد علی ارشاد علی (عالم ثانی)
محمد امین محمد حیدر (عالم ثانی)

اخیر میں صدر پروگرام مولانا عبداللہ زبیر سلفی حفظہ اللہ نے صدارتی کلمات پیش کیے اور پروگرام کی ضرورت و اہمیت اور اس کی افادیت پر روشنی ڈالی اور طلبہ کو اس طرح کے علمی پروگرام میں شرکت کرنے اور اس سے استفادہ کی ترغیب دی۔ پھر ناظم پروگرام فیضان احمد انسان علی (کلیۃ الدعوۃ/ثانی) سلمہ نے تمام شرکاء بطور خاص صدر پروگرام کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے پروگرام کے اختتام کا اعلان کیا۔

■ تیسرا پروگرام بروز جمعرات بتاریخ یکم ستمبر ۲۰۲۲ء بمقام قاعۃ المحاضرات، بعد نماز عشاء بعنوان: ''عربی زبان وادب'' منعقد ہوا، جس کا آغاز اشفاق احمد ڈار عبدالاحد ڈار (کلیۃ الشریعہ/اول) کی تلاوت قرآن سے ہوا۔ پھر منیر عام ظفیر الدین (عالم اول) نے نعت نبی ﷺ پڑھی۔ اس کے بعد اختر عالم سکندر علی (کلیۃ الدعوۃ/ثالث) نے اردو زبان میں ''برصغیر میں عربی ادب کا تحقیقی جائزہ اور اس کے اثرات'' کے عنوان پر جامع مقالہ پیش کیا۔ پھر خورشید عالم شمس الدین (عالم اول) نے بہترین آواز و انداز میں ایک نظم پڑھی جس سے مجلس جھوم اٹھی۔اس کے بعد برجستہ تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ مرحلۂ عالمیت کے طلبہ نے ''موبائل کے فوائد و نقصانات'' کے عنوان پر اور مرحلہ کلیات کے طلبہ نے ''آن لائن تعلیم کے فوائد و نقصانات'' کے عنوان پر تقریریں پیش کیں۔ پھر عبدالودود نے مزاحیہ اشعار پیش کیے۔اس کے بعد شرکاء کے درمیان انعامات تقسیم کیے گئے۔

اخیر میں صدر مجلس فضیلۃ الدکتور عبدالحلیم بسم اللہ مدنی حفظہ اللہ نے صدارتی خطاب پیش کیا۔انہوں نے حمد و صلاۃ کے بعد سب سے پہلے ''برنامج اتقان'' کی تاریخ پر مختصر مگر جامع روشنی ڈالی اور طلبۂ جامعہ کو تعلیم و تربیت سے متعلق قیمتی نصیحتیں کیں اور عربی زبان وادب پر توجہ دینے پر ترغیب دیتے ہوئے کہا کہ عربی زبان وادب میں مہارت حاصل کئے بغیر کتاب وسنت کو صحیح ڈھنگ سے سمجھنا مشکل ہے لہٰذا اس پر خصوصی توجہ دینی چاہیے نیز صدر مجلس نے طلبہ سے جو غلطیاں سرزد ہوئی تھیں ان کی نشاندہی اور اصلاح کی۔اس کے بعد ناظم پروگرام سلمان ابوالمکرم (کلیۃ الدعوۃ/ثانی) نے جملہ شرکاء خصوصاً صدر پروگرام کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے پروگرام کے اختتام کا اعلان کیا۔

(بقیہ صفحہ ۲۲ پر)

باب الفتاویٰ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک خاتون اپنے شوہر سے علیحدگی چاہتی ہے اور اس کا شوہر اسے طلاق نہیں دے رہا ہے۔ ایسی صورت میں خاتون کیا کرے؟ شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔

الجواب بعون اللہ الوھاب۔

اصل جواب سے پہلے چند باتیں ملاحظہ فرمائیں:

صورت مسئولہ میں واضح ہو کہ اسلام میں نکاح کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ مرد وعورت دونوں کی عصمت وعفت ہر قسم کی بے حیائی اور بداخلاقی کے جراثیم سے محفوظ ہو جائے، مرد وعورت کے درمیان محبت والفت اور سکون واطمینان کی خوشگوار فضا پیدا ہو جائے اور جب مرد معاشی الجھنوں اور کاروباری ہنگاموں سے فارغ ہو کر لوٹے تو ایک گوشۂ سکون وعافیت اسے میسر آسکے۔ قرآن مجید میں اللہ رب العالمین کا ارشاد ہے: **{ومن آیاته أن خلق لکم من أنفسکم أزواجا لتسکنوا الیها وجعل بینکم مودة ورحمة}** (سورہ روم:۲۱) ترجمہ: اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے آرام پاؤ، اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی قائم کر دی۔

لیکن اگر کوئی گھر امن وراحت، محبت والفت کی جنت بننے کے بجائے بے اعتمادی، بغض وعناد اور جنگ وجدل کی جہنم بن جائے تو پھر اسلام مرد کو طلاق کا اختیار اور عورت کو خلع کا حق دے کر اس قسم کے نکاح کی بیڑیوں کو توڑ دینے کا حکم دیتا ہے۔

اب خلع کا طریقہ ملاحظہ فرمائیں:

بیوی معاوضہ دے کر علیحدہ ہو جائے تو اسے خلع کہا جاتا ہے۔ اسی طرح شوہر بیوی سے معاوضہ لے کر اسے چھوڑ دے خواہ وہ معاوضہ شوہر کا دیا ہوا مہر ہو یا کچھ اور۔ اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے:

{ولا یحل لکم أن تأخذوا مما آتیتموهن شیئا الا أن یخافا ألا یقیما حدود اللہ، فان خفتم الا یقیما حدود اللہ فلا جناح علیهما فیما افتدت به، تلک حدود اللہ فلا تعتدوها ومن یتعد حدود اللہ فأولئک هم الظالمون} (البقرۃ: ۲۲۹) ترجمہ: اور تمہارے لیے حلال نہیں کہ تم نے انہیں جو دے دیا ہے اس میں سے کچھ بھی لو، ہاں یہ بات اور ہے کہ دونوں کو اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ سکنے کا خوف ہو، اس لئے اگر تمہیں ڈر ہو کہ یہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ سکیں گے تو عورت رہائی پانے کے لئے کچھ دے ڈالے، اس میں دونوں پر گناہ نہیں، یہ اللہ کی حدود ہیں خبردار ان سے آگے نہ بڑھنا اور جو لوگ اللہ کی حدوں سے تجاوز کر جائیں وہ ظالم ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ: ''**أن امرأة ثابت بن قیس أتت النبی صلی اللہ علیه وسلم فقالت یا رسول اللہ! ثابت بن قیس ما**

أعتبت عليه في خلق ولا دين ولكني اكره الكفر في الاسلام، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أتردين عليه حديقته قالت: نعم، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اقبل الحديقة وطلقها تطليقة" ترجمہ: ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مجھے ان کے اخلاق اور دین کی وجہ سے ان سے کوئی شکایت نہیں۔ البتہ میں اسلام میں کفر کو ناپسند کرتی ہوں (کیونکہ ان کے ساتھ رہ کر ان کے حقوق زوجیت ادا نہیں کرسکتی) اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: کیا تم ان کا باغ (جو انہوں نے بطور مہر دیا تھا) واپس کرسکتی ہو؟ انہوں نے کہا کہ جی ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ثابت رضی اللہ عنہ) سے فرمایا کہ باغ قبول کرلو اور انہیں طلاق دے دو۔ (بخاری: ۵۲۷۳، کتاب الطلاق، باب الخلع وکیف الطلاق فیہ، نسائی: ۶/ ۱۶۹، ابن ماجہ: ۲۰۵۶)

خلع کی صورت یہ ہے کہ عورت جب اپنے شوہر کو ناپسند کرنے لگے اور اس کے ساتھ زندگی گزارنا ناممکن سا معلوم ہونے لگے یا خاوند کے فسق وفجور اور حرام کام کے مرتکب ہونے کی وجہ سے اسے ناپسند کرنے لگے تو عورت کو چاہئے کہ اپنے اس معاملہ کو شرعی پنچ یا شرعی عدالت میں پیش کرے اور عدالت کو چاہئے کہ طرفین کو کسی مناسب وقت اکٹھا کرے اور طرفین سے معاملہ کو بغور سنے اور سننے کے بعد اگر ممکن ہو تو دونوں میں صلح وصفائی کرکے مصالحت کرادے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو بیوی کی مہر واپسی کے عوض شوہر سے بیوی کو چھوڑنے کے لئے کہے۔ خلع کی صورت میں عدت ایک حیض یا ایک مہینہ ہے، عدت گزار کر عورت اپنے ولی کی اجازت سے کہیں نکاح کرسکتی ہے، شوہر اگر خلع پر راضی نہ ہو تو عورت پنچ کے ذریعہ نکاح فسخ کرا سکتی ہے اور فسخ کی صورت میں شوہر کو مہر واپس نہیں ملے گی۔

یہ باور رہے کہ اگر عورت کسی معقول شرعی سبب کے بغیر مطالبۂ خلع کرے تو ایسی عورت پر جنت کی خوشبو تک حرام ہو جائے گی۔ جیسا کہ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان: "**أيما امرأة سألت من زوجها طلاقا في غير ما بأس به فحرام عليها رائحة الجنة**" (صحیح سنن ابی داود، باب فی الخلع ح ۲۲۲۶) سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے۔

اس لئے کسی بھی عورت کو بلا سبب مطالبۂ خلع نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ایسا کرنا شرعاً ممنوع ہے اور انجام کے اعتبار سے بہت خراب ہے۔

خلع کی پوری کارروائی کو قلمبند کرکے شرعی پنچایت ایک کاپی اپنے پاس رکھ لے اور ایک ایک کاپی فریقین کو دے دے تاکہ بوقت ضرورت کام آئے۔

هذا ما عندي والله أعلم بالصواب۔

(ابوعفان نورالہدیٰ عین الحق سلفی)

■■

PRINTED BOOK

OCTOBER 2022

ISSN 2394-0212

Vol.XXXIX No.04

R.No. 40352/81

MOHADDIS

THE ISLAMIC CULTURAL & LITERARY MONTHLY MAGAZINE

Website: www.mohaddis.org

جامعه سلفیه بنارس کی جدید مطبوعات

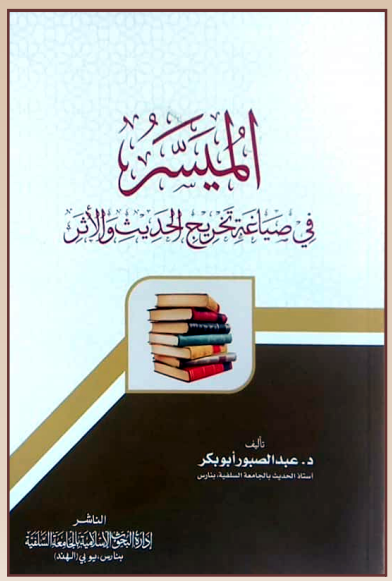

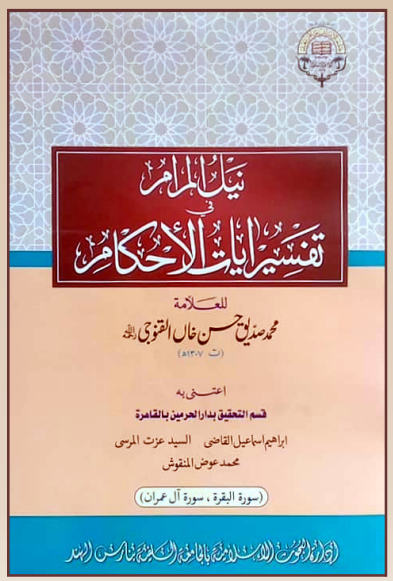

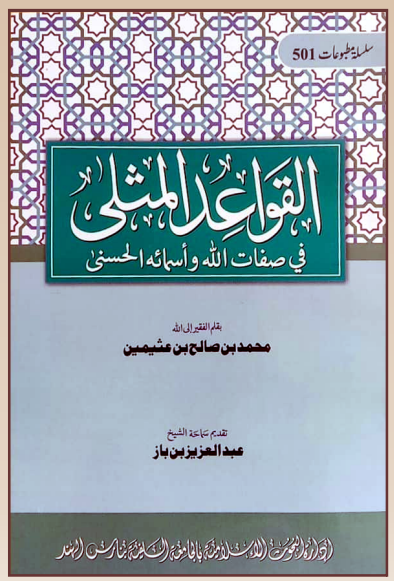

Published by: Obaidullah Nasir, on behalf of Darut-Taleef Wat-Tarjama

B.18/1-G, Reori Talab, Varanasi, Edited by: Mohammad Ayoob Salafi

Printed at Salafia Press, Varanasi.